[ایک مطالعہ]

اختر پرویز

[ایک مطالعہ]

اختر پرویز

نام کتاب: حضرت شاہ باجنؒ [ایک مطالعہ]
نام مصنف: اختر پرویز
صفحات: ۱۶۰
قیمت: ایک سو بیس روپے
پہلا ایڈیشن: ۲۰۰۵ء
تعداد: پانچ سو
کمپیوٹرازنگ: مالوہ کمپیوٹر جونار سالہ اندور۔۶
طباعت: راجا آفسیٹ اندور
سرورق: نرگس اندور
ترتیب وانتخاب: سراج احمد انصاری
ناشر: اختر پرویز
تقسیم کار:
اسلم پرویز: ممبر جنید پنچایت چلکھان برہان پور
انیس منشاء اقبال چوراہہ برہان پور
رئیس منشاء: ۹۳ راج محلہ اندور
نفیس منشاء: [کارپوریٹر] چیرمین لوک نرمان وبھاگ
"منشاء منزل" ۱۵ خانقاہ وارڈ نمبر ۲۹ برہان پور
مالوہ پبلیکیشنز جونار سالہ اندور
پتہ: اختر پرویز [سابق مونسپل کونسلر] ۱۵ خانقاہ روڈ برہان پور۔ ۲

انتساب

اپنی اس حقیر کوشش کو میں برہان پور دارالسرور کی شاہی جامع مسجد کے موجودہ پیش امام اور خطیب حضرت الحاج مولوی سیّد اکرام اللہ صاحب بخاری کے نام معنون کرتا ہوں۔ مولوی صاحب نے اور آپ کے عظیم المرتبت نانا محترم اور والد بزرگوار حضرت مولوی احکام اللہ بخاری مرحوم اور حضرت ڈاکٹر حکیم مولوی شمس التوحید بخاری مرحوم نے برہان پور کی گراں قدر تصنیف "خزانۂ رحمت" اور "ملفوظات حضرت شاہ بھکاری" کو ادب نوازوں کے لئے محفوظ اور موجود رکھ کر ہم پر اور ہمارے علم و ادب اور زبان پر ایک ایسا احسانِ عظیم کیا ہے جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں گراں بہا تصانیف سے برہان پور کے ادب کی تشکیل ہوئی ہے۔ یہ ملفوظات شہر برہان پور میں جو علم و ادب کا گہوارہ اور روحانیت کا عظیم مرکز ہے۔ آج سے قریب چھ سو سال پہلے تحریر فرمائے گئے تھے۔ جب ہمارے ملک ہندوستان میں اردو زبان کا جنم بھی نہیں ہوا تھا۔

اختر پرویز

فہرس

برہان پور ایک شہر ہے۔

شہر لندن کی تعریف کرتے ہوئے اردو کے ممتاز ادیب اور دانش ور گوپی چند نارنگ نے اپنے ایک مضمون ''لندن اردو کا نیا گہوارہ'' میں لکھا ہے کہ:

''لندن کہنے کو ایک شہر ہے لیکن ایک پوری تہذیب
ایک پوری تاریخ علم وادب اور دانشوری کی ایک پوری
روایت کا مظہر بھی ہے۔''

یہی بات باب دکن اور دارالسرور کے نام سے مشہور برہان پور سے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ کہ برہان پور کہنے کو شہر ہے۔ لیکن ایک پوری تہذیب ایک پوری تاریخ علم وادب اور دانش وری کی ایک پوری روایت کا مظہر بھی ہے۔ ساتھ ہی اسے اردو زبان وادب کا گہوارہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لندن اگر دنیا کے بے حد ترقی یافتہ ملک انگلستان کی راجدھانی رہا ہے تو برہان پور ہندوستان کی ایک عظیم الشان فاروقی سلطنت کی دو سو برس تک راجدھانی رہا ہے۔ اس کے علاوہ برہان پور مغلیہ سلطنت کا ایسا صدر مقام [صوبہ] بھی رہ چکا ہے۔ جہاں سے دکن جیسے ہندوستان کے اہم علاقوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔

واضح رہے کہ برہان پور فاروقیہ سلطنت کی راجدھانی ۱۴۰۰ء سے ۱۶۰۱ء تک رہا ہے۔ اور یہاں ۱۶۰۱ء سے ۱۷۲۰ء تک مغلیہ سلطنت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ قائم رہی ہے۔ آصف جاہی حکومت بھی یہاں اپنی شان وشوکت چالیس برس تک دکھا چکی ہے۔ مرہٹوں کا راج بھی اس شہر میں اپنی چمک دمک سے قائم رہا ہے۔ اور انگریزوں نے بھی یہاں برسوں حکومت کی ہے۔ اس لئے ہم اس شہر کو لندن کی طرح ہی ایک پوری تاریخ' ایک پوری تہذیب اور علم و دانش وری کی ایک پوری روایت کا مظہر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس مماثلت پر قاری کو تھوڑی دیر کے لئے تعجب تو ہوگا۔ لیکن وہ اس کتاب کا تھوڑا بہت مطالعہ فرمائیں گے تو انھیں میری بات میں سچائی نظر آئے گی۔ میں آپ سے پوری سچائی کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ

برہان پور مدھیہ پردیش صوبے کا ایک ایسا قدیم شہر ہے جو اپنی قدامت اور عظمت کے لئے بہت مشہور ہے۔اس شہر کی اپنی ایک شاندار تاریخ ہے۔جو ہزاروں برسوں پر پھیلی ہوئی ہے۔تاریخ کی کتابوں میں اس شہر کی قدامت کے تعلق سے جو حوالے ملتے ہیں ان سے اس شہر کی قدامت اجاگر ہوتی ہے۔یہ شہر مدھیہ پردیش کے ایک علاقہ نماڑ میں سینٹرل ریلوے [دہلی ممبئی لائن پر] بسا ہوا ہے۔اور ماضی میں نماڑ کا یہ علاقہ ہندوستان کی ایک قدیم ترین حکومت اونتی کے تحت تھا۔پھر یہ علاقہ صدیوں تک ایک حکومت کے قبضے سے نکل کر دوسری حکومت [موریوں ' سمراٹ اشوک'شونو'وامارو کال چوری' ہرش وردھن 'چالوکت'علاؤ الدین خلجی] کے زیرِ انتظام آتا اور جاتا رہا۔جن کی ایک بڑی تاریخ رہی ہے۔پھر یہاں قریب چھ سو برس پہلے فاروقیہ سلطنت قائم ہوئی۔اس شہر کے متعلق یہ بات تاریخی شہادتوں کے ساتھ کہی جاسکتی ہے اس شہر کو مشہورِ زمانہ روحانی بزرگ حضرت شیخ برہان الدین غریب [۶۵۴ھ تا ۷۳۸ھ] ابن شیخ محمد محمود ہانسوی درگاہ خلد آباد مہاراشٹر مرید خلیفہ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدینؒ دہلی کے نام پر فاروقیہ سلطنت کے دوسرے بادشاہ ملک نصیر خان ۸۰۱ھ ۸۴۰ھ نے نئے سرے سے اسے آباد کرنے کے بعد تقریبا چالیس برس تک اس شہر پر شاندار طریقے سے حکمرانی کی۔پھر اس خاندان کے تیرہ بادشاہوں نے حکومت کی۔بعد ازاں مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر [۱۶۰۱ء۔۱۵۵۶ء] نے گیارہ برس کے محاصرے کے بعد قلعہ اسیر گڑھ کے ساتھ ۱۶۰۱ء میں فتح کر کے دکن کا اہم اور صدر مقام بنادیا۔جہاں سے دکن کا قریب ڈیڑھ سو برس تک انتظام سنبھالا گیا۔

اس درمیان شہنشاہ شاہجہاں [۱۶۶۶ء۔۱۶۲۸ء] کی چہیتی بیگم ارجمند بانو عرف ممتاز محل نے اپنے شوہر سے دو وعدے لینے کے بعد ۷ جون ۱۶۳۱ء [بروز جمعہ] کو اپنی زندگی کی آخری سانس برہان پور کے شاہی قلعہ ارک کے چاندنی محل میں لی۔اور شاہجہاں نے اس کی وفات کے بعد اس کی یاد میں دنیا کی خوبصورت ترین عمارت بنانے کا خواب یہاں دیکھا۔اور اسے آگرہ شہر میں تاج محل کی صورت میں تعمیر کروایا۔

اور پھر مغل شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب نے یہاں کی ایک کنیز ہیرابائی زین آبادی کی محبت میں سرشار ہوکر برہان پور کو "محبتوں کی سرزمین" بنادیا۔

اس لئے میں نے اس شہر کو شاندار تاریخ کا حامل شہر کہا ہے۔ جو ہر لحاظ سے صحیح اور درست ہے۔ تاریخی شہر ہونے کے ساتھ برہان پور بڑا اولیاء خیز شہر بھی رہا ہے۔ یہاں جتنے اولیائے کرام ہوئے ہیں شاید ہی کسی دوسرے شہر میں ہوئے ہوں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اوران کے مقبرے ان کی درگاہیں اور خانقاہیں شہر برہان پور اوراس کے اطراف میں بہت زیادہ ہیں۔ جو دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لئے اگر ہم اس شہر کو بزرگان کا شہر کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان سب کے مبارک تذکروں سے ہماری کتابیں بھری پڑی ہیں۔

اس سلسلے میں مشہور عالم اور شاعر میر غلام آزاد بلگرامی [مصنف خزانۂ عامرہ اور دیگر] کا ایک شعر بہت مشہور ہے:

زہے مقامِ مقدس کہ اولیا خیز است
کند سپہر طواف فضائے برہان پور

ترجمہ: برہان پور کی زمین ولیوں کو پیدا کرنے والی ہے۔ یہ ایسا مقدس مقام ہے جس کی فضا کا آسمان طواف کرتا ہے۔

مولانا آزاد بلگرامی مرحوم کی اس مشہور غزل کے دیگر اشعار ملاحظہ کیجئے جس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ برہان پور کتنی خوبیوں والا شہر رہا ہے:

فزد نورِ بصیرت بقائے برہان پور
وحیدِ روح بہ قالب ہوائے برہان پور
دماغ عالمیاں راچہ تازگی بخشند
طراوت چمن دلکشائے برہان پور
سواد اعظم او بس کہ نور افشاں است
ز آفتاب زند دم سہائے برہان پور

بنام اشرف برہان دین غریب نمود
نصیر والیٔ کشور بنائے برہان پور
زہے مقامِ مقدس کہ اولیا خیز است
کند سپر طواف فضائے برہان پور
فتاد بسکہ گزر لشکر مجد را

اس شہر میں بے شمار روحانی بزرگ اور ولی کامل پیدا ہوئے ہیں نیز دیگر شہروں سے بھی سے یہاں آکر متوکن ہوئے ہیں۔ان حضرات نے یہاں قیام فرما کر نہ صرف یہ کہ رشد وہدایت کا کام بڑے پیمانے پر برسوں انجام دیا بلکہ بڑی بڑی درس گاہیں قائم کر کے اللہ کے بندوں کو درس و تدریس سے نوازا بھی ہے۔

ان بزرگوں نے بندگانِ خدا کو فیض پہونچانے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔اور ایسی ایسی گراں قدر اور بیش بہا کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں جن سے دنیا کے علم وادب کے خزانوں میں بے انتہا اضافہ ہوا۔اور ان سے طالبانِ علم و عرفان نے فائدہ اٹھایا۔اور آج بھی ایک دنیا ان سے فیض اٹھا رہی ہے۔

برہان پور کے اولیاء کرام کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ان سب کے اسمائے گرامی یہاں لکھنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔پھر بھی ان میں سے چند کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

حضرت شیخ سعدی دکنی برہان پوری' شاہ نعمان چشتی آسیر یا بن خواجہ حافظ شیرازی [ایرانی] شیخ یوسف جاسی [والدِ بزرگوار حضرت شاہ بھکاری] 'شاہ بہاؤالدین باجن' شاہ نظام الدین عرف شاہ بھکاری' شاہ حمید الدین' شاہ نظام الدین چشتی نعمانی' شاہ منصور مجذوب' شاہ جلال الدین چشتی نعمانی' شیخ ابراہیم کلہورا' شیخ احمد چشتی' شیخ نعمت اللہ' شیخ علی متقی چشتی' شیخ ابراہیم عمر سندھی' شیخ ابو جیو خضر عارفی' شیخ عبدالحکیم ابنِ شاہ بہاؤالدین باجن' اور پیر و مرشد شیخ علی متقی شیخ عبدالوہاب پیر و مرشد عبد الحق محدث دہلوی' شاہ لشکر محمد عارف' سید محمد قادری' شیخ میاں ابا ابراہیم' شیخ عبدالرحیم کریجی' شیخ محمد چشتی' شیخ طاہر محدث سندھی' شیخ سلیمان سیفی سندھی' شیخ مبارک سندھی' شیخ ولی محمد

شطاری، سیّد ابراہیم بھکاری قادری، شیخ ابراہیم قاری، مسیح الاولیاء شاہ عیسیٰ جند اللہ، شاہ برہان الدین رازالٰہی پیر و مرشد عاقل خاں رازی، شاہ محمد فضل عرف نائب رسول اللہ، خواجہ محمد ہاشم کشمی، اور بہت سے اولیائے کرام جن کے اسمائے گرامی طوالت کے خیال سے نہیں لکھ رہا ہوں۔

یہ روحانی بزرگ اور ولیٔ کامل اپنے اپنے طور پر بندگانِ خدا کو روحانی فیض بھی پہونچا رہے تھے۔ اور طالبانِ علم و عرفان کی تعلیم و تربیت بھی فرما رہے تھے۔

انھیں واصلِ حق ہوئے یقیناً ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ اور ان کی درگاہوں اور خانقاہوں کی رونقیں اب وہ پہلے جیسی نہیں رہ گئی ہیں۔ لیکن ان بزرگوں نے جو علمی و ادبی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور جو گراں قدر کتابیں تصنیف و تالیف فرمائی ہیں وہ آج بھی ان کے ناموں کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ اور ان کی درگاہیں اور خانقاہیں اس بات کی گواہ ہیں کہ ان میں مذہبِ انسانیت کو بڑھاوا دینے اور خلقِ خدا کو پاکیزہ بنانے اور سنوارنے میں برہان پور کے اولیائے کرام نے اپنی اپنی زندگیاں گزار دی ہیں۔

برہان پور کی تاریخی، سیاسی اور روحانی عظمت کے بعد میری منشاء آپ کو یہ بتانے کی ہے کہ یہ شہر علم و ادب کا کتنا بڑا گہوارہ رہا ہے۔

یہ شہر جو اردو شاعری کے قدیم شہروں میں سے ایک ہے، ازل ہی سے ریختہ شاعری سے گونج رہا تھا۔ یہاں کی شاعری کی قدامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ولی دکنی جو اردو شاعری کا قدیم شاعر ہے اور جسے اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے، اس سے بھی کئی صدیاں پہلے حضرت شیخ سعدی دکنی نے برہان پور کے آباد ہونے سے پہلے اس علاقے میں فارسی اور ہندی کے فقروں کو جوڑ کر گنگا جمنی اردو میں شاعری کی ابتدا کر دی تھی:

سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ

در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

برہان پور کی ادبی پہچان شیخ سعدی دکنی کے زمانے سے شروع ہو گئی تھی۔ اس کی ادبی شہرت میں اضافہ اس وقت ہوا جب حضرت شاہ بہاؤالدین باجن [۹۱۲ھ۔ ۷۹۰ھ] نے یہاں اپنی مشہور، زمانہ تصنیف ''خزانۂ رحمت'' مکمل کی۔ پھر آپ کے شاگرد اور مرید محدثِ اعظم شیخ علی متقی

[۹۷۵ھ-۸۸۵ھ] نے "کنز العمال" جیسی شہرۂ آفاق کتاب تصنیف کی۔ آپ کی سو سے زیادہ تصانیف نے برہان پور کو شہرت بخشی۔ پھر اس کا وہ ادبی سفر شروع ہوا جو فاروقی اور مغل بادشاہوں اور آصف جاہی حکمرانوں کی سرپرستی اور زیرِ سایہ بڑھتا ہی گیا۔

پھر عبدالرحیم خان خاناں کے تیس سالہ دور میں یہ شہر دہلی کا رتبہ پا گیا۔ یہاں انھوں نے ایک ایسی مثنوی کی تخلیق کی جس کے شعروں کا پہلا مصرعہ فارسی میں اور دوسرا مصرعہ ہندی میں ہے۔

مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے یہاں کے ایک جید عالم ملا نظام الدین کی نگرانی میں مشہورِ زمانہ "فتویٰ عالمگیری" مرتب کرواکر برہان پور کی شہرت کو چار چاند لگادیئے۔

پھر اردو کے باوا آدم ولی گجراتی کے پیر و مرشد حضرت سعد اللہ گلشن [دہلی ۱۰۷۵ھ ۱۱۴۱ھ] کی ۱۰۷۵ھ میں برہان پور میں ولادتِ باسعادت سے یہ شہر شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ ولی گجراتی [متوفی ۱۱۱۶ھ مطابق ۱۷۰۷ء [مدفون جدی قبرستان نیلی گنبد شاہی باغ احمد آباد گجرات] کی زبانِ ریختہ میں کی گئی شاعری ان کے قیامِ برہان پور میں ہر طرف دھوم مچانے لگی۔ اس طرح یہ شہر علم و ادب کا گہوارہ اور دانش وری کی روایت کا مظہر بن گیا تھا۔

اس شہر کے قابلِ قدر و احترام عالموں نے ماضی میں علم و ادب کی کتنی عظیم خدمات انجام دی ہیں اسے چند لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ پھر بھی میں مختصراً ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دسویں صدی ہجری میں مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ جیسے اسلام کے مرکزی شہروں میں زمانے کے انقلاب کی وجہ سے بقول مولوی معین الدین ندوی مرحوم علمِ حدیث کے چشمے خشک ہونے لگے تو برہان پور کے مایہ ناز اور نامور عالم حضرت شیخ علی متقی تڑپ اٹھے۔ اور اپنے عزیز وطن برہان پور سے ہجرت کر کے ان مرکزی شہروں میں سے ایک مکۂ معظمہ پہونچے۔

آپ نے وہاں حدیث کی مسند بچھا کر طالبانِ علم و عرفان کو تعلیم دی۔ سو سے زیادہ کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ اور اپنی زندگی علم حدیث کی تعلیم و اشاعت کے لئے وقف کر کے آپ نے علمِ حدیث کے تنِ نیم جاں میں نئی روح پھونک دی۔ [بحوالہ کتاب "برہان پور"]۔

یہاں ماضی میں کتنی گراں قدر کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اس کو ظاہر کرنے کے لئے میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انڈیا آفس [لندن] میں ہندوستان سے حاصل کی ہوئی کتابوں پر مشتمل ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس میں برہان پور سے لے جائی گئیں کتابیں بھی شامل ہیں۔
کتب خانہ پیر محمد احمد آباد' کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن کتب کانہ اڈنبرا یونیورسٹی [انگلینڈ]' کتب خانہ فیروز پارسی ممبئی' اورنٹیل کالج لاہور' انڈیا لائبریری لندن' نیشنل لائبریری پیرس' برٹش میوزیم لندن' کراچی یونیورسٹی کراچی میں برہان پور کی کئی گراں قدر کتابیں محفوظ ہیں۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے جسے لکھنا میرے لئے محال ہے۔
برہان پور میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی بھی بہت سی یادگار تاریخی عمارتیں ہیں۔ علاوہ اس کے یہ شہر روزِ ازل سے قومی یک جہتی اور ملی جلی تہذیب کا مرکز بھی رہا ہے۔ اس خوبی کے تعلق سے بزرگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ شہر ہندو مسلم تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھانے میں سبھی مذہب کے ماننے والوں نے یکساں طور پر کوششیں کی ہیں۔ یہ انھیں لوگوں کے خلوص و محبت' ہمدردی اور رواداری کا نتیجہ ہے کہ مشترکہ تہذیب کے نقوش یہاں کی عبادت گاہوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔
مذہبی اور لسانی رواداری کی بے شمار مثالوں میں سے ایک بہترین مثال یہ ہے کہ برہان پور کی شاہی مسجد میں' جسے پندرہویں صدی میں فاروقی باشاہ راجے علی خاں عرف عادل شاہ نے پانچ سال [۱۵۹۵-۱۶ء] کے عرصے میں سنگ خارا سے بنوایا تھا عربی کے ایک کتبے کے ساتھ سنسکرت زبان کا ایک بڑا کتبہ بھی کندہ کیا ہوا ہے۔ جو آج بھی فاروقی بادشاہوں کی قومی یک جہتی کے بیّن ثبوت کے طور پر مذکورہ مسجد میں دیکھا جا سکتا ہے۔
لسانی رواداری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اچاریہ بھاسکر کی علم حساب کی کتاب "بیج گنت" کا ترجمہ ۱۰۷۵ء میں "علم الحساب" کے نام سے یہاں ہوا ہے۔ [۱]

---

[۱] بحوالہ "معارف" اعظم گڑھ فروری ۱۹۳۶ء اور کتاب "برہان پور" صفحہ ۲۳

اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہاں کے عالم علم و ادب میں لسانی تعصب سے کتنے دور تھے۔ اور وہ نہ صرف یہ کہ اپنی زبان کے علم و ادب اور کلچر کو فروغ دیتے بلکہ دوسروں کی زبانوں کے علم و ادب اور کلچر کو بھی بڑھاوا دیتے تھے۔

تقریباً تین سال پہلے میں نے اپنے عزیز وطن برہان پور کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی غرض سے ایک مضمون "سعدی دکنی برہان پوری" لکھا تھا۔ جو بھوپال کے جریدہ "ندیم" میں شائع ہونے کے بعد ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے یہ مضمون انجمن ترقی اردو کے ادبی ہفت وار "ہماری زبان" میں بھی شائع ہو گیا۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی ہی سمجھا اور "ہماری زبان" کے مدیر جناب خلیق انجم کا بہت ہی شکر گزار ہوا۔

اس کے بعد میں نے ایک دوسرا مضمون "ذکرِ برہان پور" کے عنوان سے لکھا اسے بھی "ندیم" کے مدیر محترم اشتیاق احمد نے اپنے موقر جریدے میں نمایاں طور پر شائع فرمایا یہ مضمون بھی ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔۔ اور مجھ سے میرے کرم فرماؤں نے اصرار کیا کہ میں اس طرح کے مقالات کا سلسلہ جاری رکھوں۔ ان کی حوصلہ افزائی سے مجھ میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا۔ اور میں نے کئی مقالات لکھے۔ جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ جن میں "ہماری زبان" دہلی "ندیم" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس پر میرے کرم فرماؤں نے ان مضامین اور مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرانے کی فرمائش کی۔ اور یہ ان کا ہی خلوص ہے جو کتابت و طباعت کی جان لیوا پریشانیوں سے گزرنے کے بعد "حضرت شاہ باجن ایک مطالعہ" کی شکل میں آپ کے ہاتھوں کی زینت بنا ہوا ہے۔

اب اس انتظار میں ہے کہ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو یہ اپنی کامیابی پر ناز کرے اور پھر یہ اپنا سفر آپ کی دعاؤں کے ساتھ شروع کرے۔

سیاہ خانۂ ہستی اس انتظار میں ہے
یہ گھر جلے گا تو اس گھر میں اجالا ہوگا [بلدیو راج]

اختر پرویز

یومِ آزادی ۲۰۰۵ء

قدیم اردو کی شاخ گوجری زبان کے عظیم شاعر
شاہ بہاؤ الدین باجنؒ

شاہ بہاؤالدین باجن برہان پور دار السرور کے روحانی بزرگ اور ولیٔ کامل ہونے کے ساتھ ہی ایک اچھے عالم اور فاضل بھی تھے۔ جن کا زیادہ تر وقت تبلیغِ اسلام اور رشد وہدایت کی مصروفیت کے علاوہ طالبانِ علم وعرفان کو درس وتدریس دینے میں گزرتا تھا۔

آپ کے حلقۂ ادارت میں بے شمار طالبانِ حق تھے۔ جو دن رات آپ کی خدمت میں رہ کر فیضِ معنوی سے سرفراز ہوتے رہتے تھے۔ آپ کی خانقاہ ایک اچھی درس گاہ تھی۔ جس میں دور دور سے آئے ہوئے لوگوں کو آپ دین ومذہب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور حلقۂ ادارت میں آئے ہوئے مریدین کی ہر طرح سے تعلیم وتربیت کیا کرتے تھے۔ اس طرح آپ نے بے شمار ادارت مندوں کو اپنے علم وفضل سے درجۂ کمال تک پہونچادیا تھا۔ آپ صوفی باصفا اور درویشِ کامل بھی تھے۔ اور ایک اچھے اور عمدہ شاعر بھی۔ آپ کا شمار قدیم ترین ریختہ گو شعراء میں اور گوجری زبان کے اوّلین شاعروں میں ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ آپ کو گوجری زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ آپ ان زبانوں میں آسانی سے شاعری کرتے تھے۔ اس زمانے [چھ سو سال پہلے] ملک میں جو زبان ہندی، فارسی، گوجری اور دیگر زبانوں کو ملا کر بولی جاتی تھی اس زبان میں شاعری کر کے ریختہ کو بڑھاوادے رہے تھے۔ ریختہ کے قدیم ترین شاعر حضرت سعدی دکنی برہان پوری کے بعد آپ نے ہی ہندی اور فارسی شاعری کے فقروں کو ملا کر گنگا جمنی شاعری کی بنیاد رکھی۔ آپ درویش تھے۔ آپ کو دنیا سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ آپ کا دل گداز، اچھے اور نیک جذبات سے پُر تھا۔

اسی لئے آپ کی شاعری میں اثر تھا۔ جو سننے والے کو جلد متاثر کرتی تھی۔ اردو زبان کے اوّل ترین نقوش آپ کو شاہ باجن کی شاعری میں ملیں گے۔ آپ کا شمار نویں صدی ہجری [قریب پندرھویں صدی عیسوی] کے عظیم المرتبت صوفی بزرگوں میں ہوتا ہے آپ روحانی بزرگ اور ولی کامل ہونے کے ساتھ قدیم اردو کی شاخ زبان گوجری [یا گجری] کے مشہور ترین قدیم شاعر بھی ہیں۔ آپکی اس حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے "شاہ بہاؤالدین باجن" [مصنف ڈاکٹر شیخ فرید برہان پوری مرحوم] کے مقدمہ نگار ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم نے آپ کو قدیم اردو کی شاخ زبان گوجری [یا گجری] کے شعرائے متقدمین نہ صرف یہ کہ شمار کیا، بلکہ آپ کو شعرائے متقدمین میں سرِ فہرست بھی بتایا

ہے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم نے آپ کو ایسا جید عالم اور بے مثل شاعر قرار دیا ہے جن کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبد الحق نے اپنی تصنیف "اردو کے نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ "اور قدیم محقق حافظ محمود شیرانی ["مقالات شیرانی "حصہ اول] سے لے کر ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی [" سخن ورانِ گجرات "] جمیل جالبی [" تاریخ اردو ادب "حصہ اول]اور ڈاکٹر شیخ فرید [" شاہ بہاؤ الدین باجن "] تک سبھی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شیخ فرید نے لکھا ہے "شیرانی صاحب شاید پہلے شخص ہیں جنھوں نے باجن کے حالات اور ان کی تصنیف "خزانہ رحمت "[خزائن رحمت] کے نسخے کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلے قلم بند کئے ہیں۔ شیرانی صاحب نے اس سلسلے میں ایک قدیم ترین تصنیف [ماخذ] "تذکرۂ گلزار ابرار "[مصنف حسن غوثی مانڈوی] کا بھی حوالہ دیا ہے ۔یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی ہے۔اس کا اردو میں ترجمہ "اذکارِ ابرار" کے عنوان سے آگرہ میں ۱۹۱۰ء [۱۳۲۸ھ] میں چھپ چکا ہے۔اس میں عظیم المرتبت شاعر باجن کے حالات زندگی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خصوصاً شاہ باجن کے سنِ پیدائش اور سنِ وفات کے واحد ماخذ کے طور پر مشہور ہے مذکورہ تصنیف سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شیخ فرید نے شاہ باجن کے حالات اور ہندوی کلام پر اپنا مشہور مقالہ تحریر کیا ہے جو "دکنی اردو "مرتبہ ڈاکٹر عبد الستار دلوی میں شائع ہوا تھا۔یہ مقالہ صاحبِ موصوف کی کتاب "شاہ بہاؤ الدین باجن" کے مقدمے کے طور پر بھی شامل ہے۔اس کے بارے میں ڈاکٹر دیسائی کا کہنا ہے کہ یہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے اس سلسلے کے مقالے سے بھی زیادہ مفصل ہے۔اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ علمی دنیا میں "خزانہ رحمت "گوجری زبان کے نمونوں کے قدیم ماخذ اور باجن ایک گوجری صوفی شاعر کی حیثیت سے روشناس ہیں۔ان کے خیال سے شاہ باجن کی ضخیم کتاب "خزانہ رحمت "سے ان کی غیر معمولی تبحر علمی اور بے انتہا مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ باجن کو گوجری اور فارسی کے علاوہ علمی اور ادبی پہلوؤں پر بھی قدرتِ کامل حاصل تھی۔اس سلسلے میں ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں "شاہ باجن نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے "خزانہ رحمت "تصنیف کیا ہے۔اس میں انھوں نے اپنے پیر مخدوم رحمت

اللہ کے اقوال واحوال سے کہیں زیادہ کلمات و مناقب کئی معتبر ذرائع سے جمع کر کے اور ان کی چھان بین کرنے کے بعد قلم بند کئے ہیں۔"

اس سلسلے میں حضرتِ باجَن نے جن معتبر کتابوں اور مشائخ بزرگوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی فہرست بھی ڈاکٹر ضیاالدین ڈیسائی نے اپنے مذکورہ مقدمے میں دی ہے۔ جسے میں قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے نیچے درج کر رہا ہوں۔

تفسیرِ عباسی، تفسیرِ زاہدی، تفسیِ ضحاک، تفسیِ معنی صحیحین، بیان الفقہ، از ابواسحاق الاعظم، لوتح قاضی حمید الدین مرصاد العباد، ذخیرۂ خوارزم شاہی مفاح الجناں، وسیلۃ القلوب، تحفۃ الوحید، رسالہ شمسیہ، گلشن راز، کنز، قدور صدایہ، نیدوی، احای علوم الدین کیمیائے سعادت دلیل الحیات، روح الارواح، حکایت الصالحین، توقیع العارفین، خزینۂ جناقب، رموز الواہبین، مقصد الاقصیٰ تجسیس خانی، مناقع ادوار خواجہ معین الدین چشتی، شہاب الدین سہروردی، ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء، ملفوظاتِ برہان الدین، ملفوظاتِ لطیف الدین دریانوش، تذکرۂ عطیار وغیرہ۔ جن بزرگوں اور صوفی حضرات کے اقوال واحوال وارشادات و مناقب بیان کئے گئے ہیں ان میں سے چند کے اسمائے گرامی ڈاکٹر صاحب نے اس طرح درج کئے ہیں:

حضرت عبد القادرِ جیلانیؒ، خواجہ معروف کرخیؒ، ابو حفض حسین بن منصور حلاجؒ، شیخ عیسیٰ معاز رازیؒ، خواجہ حمیدؒ، شیخ بایزید بسطامیؒ، شیخ علی دقاقؒ، شیخ یحیٰ ترمزیؒ، امیر مغربیؒ، خواجہ حبیب عجمیؒ، ابو علی جرجانیؒ، ابو سعید ابی الخیرؒ، شیخ احمد غزالیؒ، محمد حسین مکیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ جمال الدین بانسویؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، برہان الدین غریبؒ، شیخ زین الدینؒ، مولانا وجیہ الدین چندیریؒ، مخدوم جلال الدین بخاریؒ، مخدوم سیّد خواجہؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہم۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ باجَن نے بکثرت فارسی شعراء کے کلام سے بھی اپنے بیان کی توضیح و تشریح کے لئے استفادہ کیا ہے۔ ان نا معلوم شاعروں کے علاوہ شیخ سعدی شیرازی، خواجہ حافظ، خواجہ کرک، امیر خسرو، رومی، جامی، مسعود بھی شامل ہیں۔ باجَن نے

متعدد فارسی اشعار اس طرح نقل کئے ہیں جن میں ان کی دو غزلیں بھی شامل ہیں۔ اسی طرح انھوں نے عربی فارسی استعارات سے بھی کام لیا ہے۔" [۱۰] آگے چل کر "خزینۂ رحمت" کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد نتیجہ کے طور پر ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کا یہ کہنا ہے کہ "خزینۂ رحمت" گوجری ادب کا ایک قدیم ترین ماخذ کے علاوہ موضوع کے تنوع کے اعتبار سے نہایت اہم حیثیت کا حامل ہے۔ اس سے شاہ باجن کی ہمہ گیر شخصیت اور وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلا خوف و تردید کے کہا جا سکتا ہے کہ خزائن رحمت [خزانۂ رحمت] نہ صرف باجن کے اپنے سلسلۂ چشتیہ کے مریدوں اور معتقدوں کے لئے، جن کے ارشاد و ہدایت کے لئے اصل میں یہ کتاب باجن نے تالیف کی ہے، بلکہ تصوف و عرفانِ الٰہی میں بالعموم دلچسپی لینے والوں کے لئے بھی ایک مستند کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ خزائن کی اس خوبی کی طرف تصوف اور صوفیائے کرام کے حالات قلمبند کرنے والوں کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ شاہ باجن نے اپنی گراں قدر تصنیف "خزانۂ رحمت" میں اپنا گوجری کلام بڑی تعداد میں درج کیا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے لکھے مطابق غالبًا یہ اوّلین کتاب ہے جسمیں اسکے شاعر مصنف نے اپنی کتاب کے آخر میں ایک الگ باب ["خزینۂ ہفتم"] میں اپنا گوجری کلام یکجا کر دیا ہے۔ گویا گوجری اشعار کی تدوین اس میں ہمیں قدیم ترین نمونہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ فاضل مقدمہ نگار ڈاکٹر ڈیسائی ایک خاص بات کی طرف محققین کی توجہ مبذول کرائی ہے اور وہ یہ ہے: "خزانۂ رحمت" میں نقل شدہ دیگر بزرگوں کا ہندوی یا گوجروی کلام ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ کہنا ہے کہ شیرانی صاحب نے اس کتاب کے اپنے ناقص نسخے سے شیخ حمید الدین صوفی ناگوری، شیخ فرید الدین گنج شکر وغیرہ کے کچھ ہندوی فقرے اور دوہرے نقل کئے ہیں۔ لیکن "خزائن" میں خود شیخ فرید الدین گنج شکر کے مزید کلام کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے مرید نے، جن کے پیر کے جدِ امجد شیخ محمد المقلب شیخ لطیف الدین دریانوش حضرت قطب عالم وغیرہ کے دوہے اور شیخ یحیٰ منیری بہاری کا فسوں وغیرہ درج ہے۔ ان کے علاوہ کم سے کم نصف درجن کے قریب نا مشخص بزرگوں کے ہندوی یا گجروی کلام کے نمونے ملتے ہیں۔ جن کو باجن نے اپنے کلام کی توضیح

و تشریح کے لئے نقل کیا ہے۔ یہ بلا شبہ نویں صدی ہجری یا اس سے قبل کے ہیں۔ راقم بخوفِ طوالت ان خزائن کے کراچی والے نسخے کے اوراق کا' جہاں یہ اشعار اور نمونے ملتے ہیں' حوالہ دینے پر اکتفا کرتا ہے حضرت گنج شکر فرید وغیرہ کا کلام صفحہ ۳۱۷' ۳۱۸' وغیرہ پر ہے نامشخص بزرگوں کے گوجری اشعار صفحہ ۲۸' ۴۰' ۵۹' ۹۶' ۲۷' ۲' ۲۱۲' ۵۱۲' وغیرہ پر موجود ہیں۔" [۱۲] اپنے بے لاگ اور غیر جانب دارانہ تبصرے [مقدمے] میں ڈاکٹر ڈیسائی نے حضرت بہاؤالدین کے بارے میں اور آپ کی گراں قدر تصنیف "خزانۂ رحمت" سے متعلق کئی باتیں نہایت اہم اور مفید لکھی ہیں۔ جن میں سے چند کا بیان میں نے یہاں کیا ہے۔ دو ایک اہم اور مفید باتوں کی طرف قارئین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں باجن میں سے پہلی بات تو یہ ہے کہ باجن اپنے پیر کے والد بزرگوار شیخ عزیزاللہ کے مزار' واقع مانڈو کے بیان مَیں ایک نہایت اہم انکشاف کرتے ہیں کہ پایان روضۂ مخدوم شیخ عزیزاللہ سلطان احمد شاہ گجراتی کے بیٹے مبارک خان کا چبوترا ہے تاریخ کے اوراق اس گجراتی شہزادہ کے نام سے ناآشنا ہے چہ جائیکہ اس کے مدفن اور دیگر حالات سے۔ ادھر دو سال پہلے شہزادے کے وجود کا گجرات کے سابر کامٹھا ضلع قصبہ براتیج کی ایک مسجد کے کتبہ کے ذریعہ پتہ چلا ہے جو اسوقت تعمیر ہوئی تھی جب شہزادہ مبارک خان اس نواح کا حاکم یا گورنر تھا۔ اس کے علاوہ اس شہزادے کے بارے میں اور معلوم نہ تھا۔ خزائن سے ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف دانشمند اور درویش سیرت تھا بلکہ وہ حافظ قرآن اور قاری سبع قرأت تھا۔" [۱۳۔ ۱۲]

دوسری اہم بات جو مقالہ نگار ڈاکٹر ڈیسائی نے لکھی ہے وہ' یہ ہے کہ عام طور پر "خزانۂ رحمت" کو ملفوظ سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ جو اس محتویات کے پیشِ نظر صحیح نہیں ہے۔ یہ فوائد الفواد' خیر المجالس' جوامع الکلم یا جمعات شامیہ کی طرح پیروں کے ارشادات یعنی ملفوظات کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ باجن کے پیر کے سلسلے کے مریدوں اور معتقدوں کے رشد و ارشاد کے لئے اپنے پیر اور ان کے آبا و اجداد کے حالات اور اقوال' مختلف صوفی سلسلوں اور متعلقہ امور کے مسائل' وغیرہ پر مشتمل ایک مستقل تصنیف ہے۔ اس میں باجن کے پیر کے براہ راست اقوال' ارشادات بہت کم نقل ہوئے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ سالکانِ طریقت مریدوں اور معتقدین کے دنیوی مفاد کی چیزیں مثلاً ادویہ' تراکیب' نسخہ

جات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔اسے تصوف کا رسالۂ دستورالعمل بھی کہہ سکتے ہیں 'ملفوظ نہیں۔" [۱۶]
شاہ باجن کی مذکورہ تصنیف پر ہمارے عظیم المرتبت عالموں اور ادیبوں نے اپنے انداز میں بہت ہی بہتر طریقے میں تبصرے کئے ہیں۔اور اس کی تاریخی 'لسانی 'شعری افادیت اور اہمیت کو بخوبی اجاگر کیا ہے۔ان سب تبصروں کو یہاں تفصیل کے ساتھ درج کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔اس لئے میں مذکورہ اقتباسات پر اکتفا کرتے ہوئے یہاں حضرت بہاؤالدین کے حالاتِ زندگی لکھنا ضروری خیال کر رہا ہوں۔ تاکہ قارئین کرام کو شاہ باجن کے تعلق سے اور آپ کے کلام کے تعلق سے بہت سی باتیں سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہوگی۔اور اس سے اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کو مدد بھی ملے گی۔

آپ کا اسم گرامی بہاؤالدین اور لقب اور تخلص باجن ہے۔ آپ خاص طور پر شاہ باجن کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے اب سے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال پہلے فارسی زبان میں ملفوظات [کتاب] تحریر فرمائے ہیں۔جو "خزانۂ رحمت" کے نام سے مشہور ہیں۔ان ملفوظات میں آپ سے اپنے پیر مخدوم رحمت اللہ کے حالات وارشادات قلمبند فرمائے ہیں۔ ساتھ ہی ان میں اپنے حالات بھی تحریر فرمادیئے ہیں۔ان ملفوظات کے پیشِ نظر ہمارے قابلِ صد احترام عالموں اور ادیبوں نے اپنی اپنی تصانیف میں شاہ صاحب موصوف کے حالاتِ زندگی قلمبند کئے ہیں۔ جن گراں قدر تصانیف میں شاہ صاحب موصوف کے حالاتِ زندگی دیکھے جاسکتے ہیں ان کے نام اس طرح ہیں:
[۱] خزانۂ رحمت [ملفوظات حضرت شاہ باجن] [۲] گلزار الابرار ترجمہ اذکارِ ابرار [محمد حسن غوثی مانڈوی] [۳] مقالاتِ شیرانی حصہ اوّل [محمود شیرانی] [۴] خزینۃ الانبیاء [غلام محمد سروری لاہوری] [۵] تاریخِ برہان پور [مولوی خلیل الرحمان برہان پوری] [۶] سخن ورانِ گجرات [ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی مرحوم ابن جناب سیّد حمید الدین حشمت سورتی مرحوم] [۷] تاریخِ اولیاء کرام برہان پور [بشیر محمد خاں ایڈوکیٹ مرحوم برہان پوری ابن محمد عثمان خاں راغب برہان پوری مرحوم] [۸] [مولوی معین الدین ندوی برہان پوری مرحوم] [۹] سلکِ گوہر [جاوید انصاری]۔
ان میں شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

حضرت شاہ باجن کی ولادتِ باسعادت ایک نہایت علم دوست اور صوفی شخص حاجی معزالدین کے ہاں ہوئی۔ حاجی معزالدین عارفِ کامل اور بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ایک زمانہ آپ کا معترف تھا۔جب شاہ صاحب چار سال کے تھے کہ آپ کے والد کو نامعلوم اشخاص نے شہید کر دیا تھا۔ آپ کا نسب اس طرح ہے۔ بہاؤالدین الملقب بہ باجن ابن معزالدین زائرالحرمین وشہید ابنِ علاؤالدین ابنِ شہاب الدین ابنِ شیخ عبدالملک المعروف بہ شیخ ملک ابنِ احمد القریشی المطابی ابن المعروف بہ آدم ابنِ آدم ابنِ یعقوب ابنِ سلیمان ابنِ دانیال ابنِ شہاب عرف شہاب الدین داؤدی ابن ترک اللہ انب، عبداللہ ابنِ فضل اللہ ابنِ ہابیل ابنِ زید بن خطاب حضرت زید حضرت امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔اس طرح آپ حضرت امیر المومنین کے خاندان سے تھے۔ حضرت خطاب کے بعد ۲۸ واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت اسماعیلؑ پر مبنی ہے۔[۲۷ تاریخ اولیاء کرام برہان پور]۔

"خزانۂ رحمت" کے صفحہ ۱۱ کا حوالہ دیتے ہوئے جناب بشیر محمدؒ ایڈوکیٹ مرحوم نے اپنی تصنیف میں شاہ باجن کے جدِّ اعلیٰ کے تعلق سے لکھا ہے کہ "شاہ باجن نے اپنے چوتھے دادا مولانا احمد القریشی الخطابی کے حالات اس طرح بیان کئے ہیں کہ ان کی سکونت مدینہ منورہ میں تھی۔اور ان کا سلسلۂ ارادت مشائخ مدینہ سیّدی ابو مدین سے تھا۔اس زمانے میں وہ مدینہ میں تمام علوم میں فائق اور خصوصاً علمِ حدیث میں بے بدل تھے۔

ان کو رسالت علیہ السلام خواب میں تعلیم دیتے تھے۔اور مولانا آدھی رات کو آنحضرت مصطفیٰؐ کے روضۂ منورہ کی آستانہ بوسی کے لئے تنہا یا جایا کرتے تھے۔

ایک دن یکایک دل میں سیر و تفریح کی آرزو پیدا ہوئی تو اپنے فرزند شیخ عبدالملک کو ہمراہ لیا اور کچھ دوست طلباء بھی ساتھ ہو لئے اور چل نکلے۔ عراقین، خراسن اور ماوراء النہر کی سیر کرتے ہوئے دہلی پہونچے۔چند سال دہلی میں احادیثِ نبوی کا درس دے کر لوگوں کو مستفید کرتے رہے۔ بڑے بڑے لوگ آپ سے محبت کرنے لگے۔اور بادشاہ دہلی بھی معتقد ہو گیا۔ نیز توشۂ تقدیر دامن گیر ہوا۔بادشاہِ دہلی نے کمالِ عجز و دلداری اور نہایت خواہش کے ساتھ عروسی جشن ترتیب دے کر شیخ ملک کو اپنا داماد بنالیا۔" [خزانۂ رحمت صفحہ ۵۵]

اذکارِ ابرار'' صفحہ ۲۱۲۔ ۲۱۳] اور [''تاریخِ اولیاء کرام'' صفحہ ۷۳۔]

آپ کے والدِ بزرگوار کے تعلق سے مذکورہ کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ سات مرتبہ حرمین شریف کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔ اور آپ مشہورِ زمانہ روحانی بزرگ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے نہ صرف بے حد معتقد اور مرید تھے بلکہ آپ سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کئے ہوئے تھے۔

دہلی میں اپنی زندگی کے کئی سال گزارنے کے بعد آپ کے دل میں اپنے آبائی وطن جانے کی خواہش پیدا ہوئی اور آپ حجاز جانے کا ارادہ کر کے اپنے وطن ثانی دہلی سے روانہ ہوئے۔ راستے میں آپ کا قیام گجرات کے مشہور شہر احمد آباد میں ہوا۔ آپ کا ارادہ یہاں کچھ دن گزارنے کا تھا لیکن آپ کو اس شہر کی آب وہوا اور ماحول اس قدر پسند آیا کہ آپ نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

احمد آباد میں حضرت شاہ باجنؒ کی ولادتِ باسعادت مولانا حاجی معزالدین کے یہاں ۷۹۰ھ میں ہوئی۔ آپ کی تمام تر تعلیم وتربیت آپ کی والدہ محترمہ کے زیرِ سایہ ہوئی۔

آپ کے ارادت کے تعلق سے ''خزینۃ الانبیاء'' میں لکھا ہے کہ آپ عزیز اللہ متوکل [والدِ بزرگوار شیخ رحمت اللہ] کے مرید تھے۔ مگر شاہ باجنؒ نے اپنے ملفوظات میں کئی جگہ اس بات کو تحریر فرمایا ہے کہ مخدوم رحمت اللہ سے شرفِ مریدی اور خرقۂ ارادت حاصل کئے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے مذکورہ پیر کی خدمتِ اقدس میں رہ کر کسبِ فیض کیا۔ اور ولایت کے درجے تک پہونچے۔

کہتے ہیں کہ آپ کو اپنے بزرگوں کی طرح سیر وسیاحت کا بے حد شوق تھا۔ اسی شوق کے تحت آپ احمد آباد سے روانہ ہوئے اور سیر وسیاحت کرتے ہوئے خراسان پہونچے۔ اور فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے کعبہ جانا ہی چاہتے تھے کہ ایک دن اپنی ساری توجہ حضرت رسالت علیہ السلام اور اپنے پیر کی طرف کی تو مراقبے میں دیکھا کہ آمحضرت رسولِ مقبولؐ اپنے چاروں اصحابِ برگزیدہ کے ہمراہ حضرت شیخ رحمت اللہ کے جماعت خانہ خود بھی تشریف فرما ہیں۔ آپ کے پیر حضرت بھی موجود ہیں۔ اور یہ خود بھی مجلس میں حاضر ہیں حضرت رسالت علیہ السلام فرماتے تھے کہ اے شیخ رحمت اللہ تمہارے مرید نے جو ارادۂ حج کیا ہے وہ قبول ہوا۔ اس سے کہو کہ اب اپنے وطن کو مراجعت کرے۔ اور جو خرقہ وفرمان ابو احمد کے پاس رکھا ہوا ہے ان سے اس امانت کو حاصل کرے حضرت

شاہ باجن نے اس کی تعبیر رحلتِ پیر سے کی۔ چنانچہ نفس الامر میں بھی ایسا ہوا۔ آپ وطن کی طرف لوٹ گئے۔[''خزانۂ رحمت ''۶۸'' تاریخ اولیائے کرام برہان پور'']

ظہیر الدین مدنی مرحوم نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے یہ عبارت نقل کی ہے:

''ایں فقیر از طرف سندھ خراساں واز طرف دکن تا سیلاں مسافرت نمود''۔

اس کے لئے مدنی صاحب مرحوم نے ''خزانۂ رحمت ''مملوکہ احکام اللہ حضرت کا حوالہ دیا ہے۔

بعد کے حالاتِ زندگی آپ نے [مدنی صاحب مرحوم] نے یوں تحریر فرمائے ہیں:

''باجن حجِ بیت اللہ کی غرض سے حجاز گئے تھے۔ کہ ان کے مرشد کا انتقال ہو گیا۔ حضرت رحمت اللہ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ لہٰذا انھوں نے وفات سے قبل خرقہ اور فرمان اپنے بھتیجے عطااللہ ابن شیخ شبہ اللہ کے سپرد کر کے ہدایت کی تھی کہ شاہ بہاؤالدین کے لوٹنے پر انھیں تبرکات دے دیے جائیں۔ جب باجن احمد آباد پہونچے تو شیخ عطااللہ نے تبرکات باجن کے حوالے کر دیئے۔ باجن نے خرقہ اور فرمان کو مرشد کے مزار پر رکھ دیا۔ ادھر قوالوں نے باجن کا کلام گانا شروع کیا اور جب قوال اس سخن پر پہونچے:

شاہ رحمت اللہ رے منجہ پیہ ملاؤ

تم باج لاگوں کس کے پاؤ [پاؤں]

اس وقت قبر سے ندا آئی ''باجن لاگے تیرے پاؤ'' اس وقت باجن پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو گئی۔

''بیہوش کہ حق یست'' جیسے ہی باجن نے دونوں ہاتھ اونچے کئے خرقہ خود بخود جسم پر زیب تن ہو گیا۔ لقب باجن بھی اسی وقت سے مشہور ہوا۔'' چند سال باجن نے شیخ عطا اللہ کی خدمت میں گزارے۔ باجن نے ایک دِن احمد آباد سے رختِ سفر باندھا اور بیدر پہونچ کر چلہ کشی کی اس کے بعد گجرات واپس آگئے۔ یہاں آٹھ سال ریاضت میں گزارنے کے بعد برہان پور کا قصد یوں ایک بار حضرت رحمت اللہ نے بشارت دی تھی:

مقامِ شما برہان پور است
وصال شما ہمانجا خواہد شد

اور جب برہان پور کے سفر کا ارادہ کیا تو خواب میں حضرت برہان الدین نے بشارت دی کہ: "برہان پور حوالہ شما کردیم واجازت نامہ نوشتہ دادند" [۴۸] شاہ باجن کو جو لقب اپنے پیر کی جانب سے ملا تھا اس کے معنی ہندی اور فارسی میں مزامیر [بخبتر] ہے۔ جب آپ کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو گئی تو آپ کے پیر نے خواب میں آکر فرمایا کہ تمہارا مقام برہان پور ہے۔ تمہارا وصال بھی اسی جگہ ہو گا۔"

یہ سن کر آپ کو بے حد مسرّت ہوئی۔ لیکن آپ کسی وجہ سے برہان پور نہیں جا سکے۔ پھر ایک مدّت بعد آپ کے دل میں حضرت برہان الدین غریب کے روضہ کی زیارت کی خواہش پیدا ہوئی تب آپ دولت آباد پہونچے اس وقت روضۂ مذکور کے متولی شیخ جیون نے اپنے پیر کی بشارت کے مطابق آپ کو پیر کی پشواز عنایت کی۔ اسی روز حضرت برہان الدین غریب نے آپ کے خواب میں آکر فرمایا:

"تمہارا مقام برہان پور ہے جو ہم نے تمہارے حوالے کیا۔"

پھر شاہ باجن بیدر کے لئے روانہ ہوئے۔ بیدر میں حضرت مسعود بک کے خلیفہ حضرت شیخ منجھلے کی خدمت میں رہ کر آپ نے چلّہ کشی کی۔ اور مسعود بک کا خرقہ حاصل کیا۔ پھر آپ احمد آباد واپس آگئے۔ اور یہاں آٹھ سال تک گوشہ نشیں رہ کر ریاضت کی۔ پھر فرمانِ دیرنیہ کے مطابق برہان پور کے لئے روانہ ہوئے۔ اور برہان پور کے قریب موضع خانہ پور میں قیام فرمایا۔

والیٔ برہان پور کو جب آپ [شاہ باجن] کے خانہ پور میں قیام کا حال معلوم ہوا۔ تو وہ چند مشائخین کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے برہان پور آنے کی درخواست کی۔ شاہ باجن نے والیٔ برہان پور کو شرَفِ قبولیت بخشا اور برہان پور تشریف لے آئے۔ اور وہاں قیام فرمایا جہاں آپ کی درگاہ واقع ہے۔ برہان پور میں آپ کی درگاہ شاہ بازار [لکھیڑ واڑی] زیارت گاہ

بنی ہوئی ہے۔ برہان پور میں آپ کے قیام کے لئے گھر' خانقاہ اور مسجد تعمیر کی گئی۔

برہان پور کی فاروقیہ سلطنت کا آٹھواں فاروقی باشاہ اعظم ہمایوں ابنِ حسن خاں نواسہ سلطان محمود بیگرہ بادشاہ گجرات]شاہ صاحِب کا بے حد معتقد تھا۔ اس کے حکم پر وزیرِ سلطنت ملک الشرق تاج بن کیلا نے شاہ صاحِب کے لئے مسجد اور خانقاہ وغیرہ ۸۷۷ھ میں تعمیر کروائی تھی۔ جو آج بھی قابلِ دید حالت میں موجود ہے۔

برہان پور میں شاہ بہاؤالدین باجن کی تشریف آوری کا سن ۸۷۲ھ تاریخی شواہد سے تسلیم کیا جاتا ہے۔

برہان پور میں آپ کے قیام کے تعلق سے ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم کا یہ کہنا ہے کہ برہان پور میں شاہ باجن کے قیام کا تعین مشکل ہے۔ چالیس برس کی عمر میں احمد آباد کے خواب سفر اور بعد میں آٹھ سال تک قیامِ احمد آباد کو محسوب کیا جائے تو تقریباً ۵۵ یا ۶۰ سال ہوتے ہیں۔ گویا انھوں نے عمر کا نصف حصّہ وہاں گزارا۔'' [صفحہ ۸ شاہ بہاؤالدین باجن]۔

اگر تعمیرِ مسجد [سنِ بنیاد ۸۷۷ھ] سے ۵۱۴ھ سال قبل برہان پور میں اقامت گزینی کا شمار کریں تو تقریباً ۴۰ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ برہان پور میں زہد و عبادت ریاضت میں مصروف ہوگئے۔ اور رشد وہدایت کی مسند پر متمکن ہوئے۔''

''سخن ورانِ گجرات'' کے مصنف ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم اپنی مذکورہ کتاب میں بہت پہلے ۱۹۸۱ء میں لکھ چکے ہیں:

''برہان پور میں ان کی عمر عزیز کے چالیس سال گزرے۔'' [۴۸]

اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ حضرت شاہ بہاؤالدین باجن نے قدیم زمانے کی فاروقیہ سلطنت کے دار الخلافہ برہان پور' دار السرور میں چالیس سال تک مستقل سکونت اختیار کر کے طالبانِ علم و عرفان کو رشد ہدایت بھی کی۔ اور درس و تدریس کی خدمت بھی بے لوث انجام دی۔ اسی درمیان آپ نے جو کلمات اپنے پیر شیخ رحمت اللہ کی زبان سے سنے تھے اور مشائخِ سلف سے' سب جمع کر کے ایک کتاب تصنیف کی اور پیر کے نام کی مناسبت سے اپنے ملفوظات کو

"خزانۂ رحمت" سے موسوم کیا۔

تاریخی شواہد سے یہ بات طے ہے کہ شاہ باجن نے اپنے گراں قدر ملفوظات برہان پور میں نویں صدی یا آٹھویں صدی میں ۸۷۲ھ [یا ۸۷۳ھ] کے لگ بھگ ضبطِ تحریر میں لانا شروع کئے تھے۔ یہ ملفوظات جو کہ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، کس سن میں پایۂ تکمیل تک پہونچے، کہنا مشکل ہے۔ تذکروں کی کتابیں اس سلسلے میں خاموش ہیں۔

۸۷۲ سے پہلے برہان پور میں کسی کتاب کے لکھے جانے کی تحقیق ابھی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے ہم یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ شاہ باجن کے مذکورہ ملفوظات ہی سے برہان پور میں ادب کی تشکیل ہوئی۔ اور آپ کی گراں قدر تصنیف "خزانۂ رحمت کو برہان پور کی پہلی تصنیف ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ برہان پور میں اردو شاعری کی ابتدا حضرت سعدی دکنی برہانپوری کے کلام سے ہوئی۔ اس لحاظ سے شاہ باجن برہان پور کے دوسرے شاعر ہیں جن کا ہندی اور گجری کلام یہاں گونجا بھی اور ترتیب بھی پایا ہے۔ اور جو ہمارے سامنے کتابی شکل میں موجود ہے۔ یہ ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے:

برہان پور میں آپ کا وصال ۱۴ ذیقعدہ ۹۱۲ھ میں ہوا۔

شاہ باجن نز دیتا بچگوں محبوب شد
سال تاریخِ وفاتش در حروف خوب شد [۹۱۲]

یہ تاریخِ وفات آپ کے ایک مرید نے لکھی ہے جو بہت مشہور ہے۔
ایک دوسرے شاعر نے ایک عدد کے تدخلہ سے تاریخِ رحلت خوب کہی ہے:

شاہ باجن در زمانش قطب بود
رختِ خود راچوں بسوئے حق بود
از سرِ افسوس شد تاریخِ آں
شاہ باجن عاشقِ اللہ بود

۹۱۱ + ۱ = ۹۱۲ھ

قطعہ تاریخ در فخر الواصلین:

چوں بہاؤ الدین باجن کے شود
ذات پاکش رحمت اللہ بود
روز نقل شیخنا ہاتف گفت
مثل شیخ شاہ کس بنود
شاہ باجن عاشقِ اللہ بود
زاں کہ شاہ از علم حق آگاہ بود
شاہ باجن واقفِ اسرار بود
رحمتِ خود چوں بسوئے حق ربود
گفت ہاتف روزِ وصلِ شیخنا
شاہ باجن عاشقِ اللہ بود
۹۱۲ھ

[نمبر ۸۹ "تاریخ اولیائے برہان پور"]

آپ کا مزار برہان پور میں محلّہ شاہ بازار [لکھیرواڑی] میں واقع ہے۔ آپ کے مزار پر سنگین گنبد بنا ہوا ہے۔ جسے برہان پور کے فاروقی بادشاہ ہمایوں اعظم نے تعمیر کرایا تھا۔ گنبد میں داخل ہونے کا دروازہ جنوبی رخ پر ہے۔ جس کی پیشانی پر آپ ہی کا قطعہ [یا رباعی؟] سنگِ مرمر پر مینا کے نیلگوں حروف میں منقوش ہے۔

آپ کے پانچ فرزند اور ایک دختر تھیں۔ فرزندوں کے نام ایڈوکیٹ مرحوم نے اسطرح لکھے ہیں:
[۱] شاہ عبدالحکیم [مدفون احاطہ شاہ باجن مسجد کی جنوبی بازو کی گلی میں] [۲] شاہ بہلول [مزار کھنڈوہ برہان پور روڈ کے کنارے] [۳] مستان شاہ [مزار راویر ضلع جلگاؤں مہاراشٹر] [۴] محمد معصوم [مزار کھجور کی مسجد چوک بازار برہان پور [۵] محمد یحییٰ [مزار کا علم نہیں ہے]۔

بقول مصنف ''تذکرۂ اولیائے دکن '''' آپ کی صاحبزادی سیّد میراں حیدر آبادی سے بیاہی گئی تھیں ان کے فرزند قطب عالم تھے۔[بحوالہ ''تاریخ اولیائے کرام برہان پور صفحہ ۹۱]

حضرت شاہ باجن کے بے مثل علم و فضل کا اندزہ آپ اس بات سے اچھی طرح لگا سکتے ہیں کہ آپ کے ایک نام ور مرید شیخ علی متقی بن حسام الدین تھے۔اور جنھوں نے عربی اور فارسی میں ایک سو سے زیادہ کتابیں تصنیف و تالیف کی تھیں۔اور ایک کتاب بارہ ہزار ابیات پر مشتمل تھی نہایت اچھے خط میں بارہ راتوں میں ختم کردی۔[۲۰۸ تاریخ اولیائے برہان پور]

آپ کی مشہورِ زمانہ تصنیف ''کنز العمال'' عربی میں ہے۔یہ کتاب ۹۵۷ھ میں تصنیف کی گئی۔و دائرۃ العارف نظمیہ حیدر آباد[دکن] سے ۱۳۱۳ھ میں طبع ہو کر شائی ہو چکی ہے۔

اس کتاب کی آٹھ جلدیں کتب خانۂ پیر محمد شاہ میں موجود ہیں،اس کے تین نسخے [قلمی] بھی مذکورہ کتب خانہ میں موجود اور محفوظ ہیں۔

حضرت شیخ علی متقی کا وصال ۹۷۵ھ میں مکہ معظمہ میں ہوا۔آپ وہیں مدفون ہیں۔آپ کی تاریخِ وفات شیخ مکہ متابعت نبیاور قضی تضی تخیہ سے بر آمد ہوتی ہے:

آں کہ او ہادی خفی و جلی ست
متقی زمانہ شیخ علی ست
وارثِ علم مرسلیں بودہ
خادمِ دہر رانگیں بودہ
درۃ التاج اتقیا و بود
گوئی تقوئی ازیں رانہ نہ بود
در احادیث بود بے ہمتا
ہمچوں در اختراں قمر یکتا
بہ نقاہت عدیل او عدم است
عاجز از وصف او قلم است

ا ز جما د ی نخت بو د د و م
کہ علی شد با و ج چر خ نہم
سا لِ تر حیل ا و ر قم ا فتا د
و ا ر ثِ الا نبیاء بحق جاں د ا د

۹۷۵ھ [۲۱۹]

شاہ باجن کے سبھی فرزند نہایت پرہیز گار اور عبادت گزار تھے۔اور صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند ہونے کے ساتھ درس وتدریس اور رشد وہدایت میں مشغول رہتے تھے۔یہ علم وفضل میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔خاص طور سے آپ کے بڑے فرزند حضرت شیخ عبدالحکیم زبردست عالم وفاضل تھے۔

آپ کو آپ کے علم وفضل کے پیشِ نظر جید عالم اور فاضلِ اجل کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔آپ کے سامنے بڑے بڑے عالموں نے زانوئے ادب طے کیا۔جن میں مشہورِ زمانہ جید عالم حضرت متقی نے آپ کے [شاہ باجن] فرزند بزرگ اور جاں نشین حضرت شیخ عبدالحکیم کی خدمت میں حاضر ہو کر نہ صرف یہ کہ آپ کے ہاتھوں پر بیعت کی بلکہ آپ کی خدمتِ اقدس میں رہ کر تھوڑے ہی عرصے میں جملہ مقامِ چشتیہ طے کر کے خلافتِ چشتیہ کا خرقہ حاصل کیا۔[بحوالہ "تاریخ اولیائے برہان پور صفحہ ۲۰۴]

شیخ عبدالحکیم اپنے والدِ بزرگوار کی طرح صاحبِ تصنیف تھے۔آپ کی ایک قلمی یادگار حاشیہ تلخیص الفاتح کے تعلق سے ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے اپنی تصنیف "شاہ بہاؤالدین" میں تحریر فرمایا ہے کہ "یہ قلمی یادگار کتب کانہ درگاہ برہان الدین رازِالٰہی [برہان پور] میں محفوظ ہے"۔[۱۱]

شاہ باجن کے پسر زادہ شیخ فریب ابن شیخ شیک عبدالحکیم بڑے متاقی اور پرہیز گار تھے۔ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم کے لکھے مطابق "گلزارِ ابرار" [قلمی ورق ۳۹۶]اور "ثمرات الحیات" مرتبہ عاقل خان رازی قلمی] کے چند ثمرات میں شیخ فرید نے فارسی اور عربی کی بہت سی مبسوط کتابوں کا انتخاب اس طرح کیا ہے کہ وہی ان مبسوط کتابوں کے معانی کا فائدہ دیتا ہے۔فارسی میں شعر بھی

کہتے تھے۔ انکی تخلیقاتِ نظم و نثر کا پتہ نہ چل سکا۔[۱۱]

اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت شاہ باجن کے ایک نواسے یا پسر زادے [نبیرہ] نے فقہ حنفی پر ایک مبسوط کتاب "مراۃالمسائل" تصنیف کی تھی۔

شاہ باجن کی اولاد میں سے ایک صاحبِ تصنیف فرد شاہ اسد اللہ صاحب زادہ قدرت اللہ نے انوار الاخبار اور مشکوۃ النبوۃ کے حوالے سے کیا ہے۔ یہ اسد اللہ "خزانۂ رحمت" کے کاتب بھی ہیں۔ جو کراچی یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ کراچی کا "خزانۂ رحمت" کا خطی نسخہ ان پانچ نسخوں میں سے ایک ہے جن کا اب تک پتہ چل سکا ہے۔

حضرت شاہ باجن کے نمونۂ کلام کو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے:

حضرت شاہ باجن کتنے عظیم المرتبت عالم اور شاعر تھے اور آپ نے مخلوط اردو زبان کو مقبولِ عام بنانے اور بڑھاوا دینے میں کتنی یادگار اور کتنی بہترین کوشش کی ہے اس کو "سخن ورانِ گجرات" کے مصنف ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم نے اردو [زبان] کو برتنے اور ادبی زبان بنانے میں صوفیہ کا سب سے بڑا حصہ ہے لکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

اردو کئی ناموں سے یاد کی گئی۔ مثلاً ہندوی، ہندی، ہندوستانی زبان
زبانِ ہندوستان، ریختہ، زبانِ اردوئے معلیٰ علاقائی مناسبت سے
اردو کے نام گجری اور دکنی سب سے قدیم ہیں۔

جب اردو کا چلن بڑھتا گیا تو صوفیا نے اس کو بھی اپنا لیا۔ اس سلسلے میں ذیل کا اقتباس دیکھئے:

"گمان نکند کہ ہیچ اولیاء بہ زبانِ ہندی تکلم نہ کردہ زیرا کہ اوّل از جمیع اولیاء
وطب الاخطاب خواجہ معین الحق والملتہ والدین قدس سرہٗ و حضرت خواجہ
گنج شکر در زبانِ ہندی و پنجابی بعضے از اشعار نظم فرمودہ چنانکہ در مردم مشہور اند"

ایسی کئی شہادتیں ملتی ہیں کہ صوفیا درس و تدریس میں بھی مخلوط زبان کا استعمال کرتے تھے۔

اس اقتباس میں خاص بات یہ ہے کہ اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو گجرات کے

ایک بزرگ شیخ بہاؤالدین باجن کی تخلیقات کو اوّلیت کا] درجہ] فخر حاصل ہے۔
ایں مناجات بہ زبانِ ہندوی گفتہ است:

تیرے پنتھ کوئی چل نہ سکے
جو چلے سو چل چل تھکے
پڑھ پنڈت دھوتیاں
سب جان سدھ بدھ کھویاں
سب جوگی جوک بسارے
سبھ پنڈی تب پکارے [وغیرہ]

باجن اپنی ایک ایک دوسری نظم کو یہ سرخی دیتے ہیں: [مناقبت]

جب راوت جھوجھن جاونہ
تب تو تو میں ہوا جائیں
جھو جھکر باہر [جاونہ]
تپ تو پچھیں ہوا آئیں
باجن بروہی جو خدا فرمایا
محمد کو کافر نہ سوں وندایا

اس اقتباس سے میں نے اوپر جو برہان پور کے روحانی بزرگ اور ولیٔ کامل قدوۃ السالکین اور زبدۃ العارفین حضرت بہاؤالدین باجن کے تعلق سے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے، یہ ثابت ہوتا ہے۔

حضرت شاہ باجنؒ کی شاعرانہ عظمت

اردو کی قدیم شاخ زبان گجری کے قدیم شاعر حضرت بہاؤالدین باجنؔ نے اس زمانے میں فارسی ہندوی اور گجری زبانوں میں شاعری کی جب ہند میں اردو کا جنم بھی نہیں ہوا تھا۔

اس زمانے میں یعنی آج سے چھ سو سال پہلے شاہ باجنؔ "بابِ دکن" کہلانے والے شہر برہان پور میں ہندی اور فارسی کے فقروں کو جوڑ کر جہاں گنگا جمنی شاعری کر رہے تھے وہیں اردو کی قدیم شاخ زبانِ گجری میں بھی اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔اور شاعری کی قدیم زبان ریختہ کو بڑھاوا دے رہے تھے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برہان پور کے مشہور روحانی بزرگ اور عظیم شاعر حضرت شاہ باجنؔ کے قریب دو سو سال بعد ہندوستان میں اردو کا جنم ہوا۔ آپ کا شمار ریختہ کے قدیم اولین شعراء ہی میں نہیں ہوتا بلکہ آپ کو ریختہ کے موجد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

آپ کتنے عظیم شاعر ہیں؟اور آپ کس زمانے میں شاعری کر رہے تھے؟اس کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ کتاب "برہان پور" کے مایہ ناز مصنف مولوی معین الدین ندوی مرحوم[متوفی ۱۹ دسمبر ۱۹۷۸ء مدفون درگاہ حضرت عیسٰی احاطہ سندھی پورہ برہان پور] نے اپنی مذکورہ کتاب میں آپ کا تعارف ان الفاظ میں کروایا ہے:

"ولی دکنی جو اردو کا قدیم شاعر ہے اور جسے کسی زمانے میں اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا تھا،اس سے بھی دو سو سال پہلے برہان پور کی فضا حضرت بہاء الدین باجن کی اردو شاعری کے نغموں سے گونج رہی تھی"[۱۲۔۱۳]

اس کے ساتھ آپ اس گراں قدر تصنیف کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے جس سے آپ کو نہ صرف یہ کہ برہان پور دار السرور کی شاعری کی قدامت کا اندازہ ہوگا بلکہ یہاں کے قدیم اور بزرگ شعراء کی شاعرانہ عظمت کا بھی اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا۔ جن میں دیگر شعراء کے علاوہ بزرگ ترین شاعر حضرت بہاؤالدین باجن بھی شامل ہیں۔

یہ اقتباس جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ذرا طویل ہے لیکن دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔اسی لئے میں اسے قارئین کی خدمت میں ان کی معلومات اور دلچسپی کے لئے درج کرنے کی جرأت کر رہا

ہوں:

اس اقتباس کا عنوان مولوی صاحب مرحوم نے "اردو شاعری کی اشاعت دکن دہلی اور پنجاب میں" رکھا ہے۔ وہ اقتباس یہ ہے:

"برہان پور میں اردو شاعری کا جو دور حضرت شیخ سعدی دکنی اور حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؔ سے شروع ہوا تھا وہ برہان پور تک محدود نہ رہا۔ بلکہ دکن، دہلی اور پنجاب تک پہونچ گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہیکہ برہان پور کے ایک بزرگ شاعر شاہ سعد اللہ گلشنؔ کے ایک شاگرد ولیؔ سے اردو شاعری کی اشاعت دکن میں ہوئی۔ اور دوسرے شاگرد خواجہ ناصر عندلیبؔ سے دہلی میں۔ خواجہ ناصرؔ سے اردو شاعری کا جو سلسلہ دہلی میں شروع ہو کر پنجاب تک پہونچا اس میں میر دردؔ، شاہ نصیرؔ، استاد ذوقؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ مولوی محمد حسین آزادؔ، حضرت داغؔ دہلوی، نوحؔ ناروی اور علامہ اقبالؔ جیسے نامور شاعر پیدا ہوئے۔ یہ تمام شعراء اردو شاعری کے اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جو حضرت شاہ سعد اللہ گلشنؔ برہان پوری سے شروع ہوا تھا۔ حضرت شاہ سعد اللہ گلشنؔ کے شاگردوں کا وہ شجرہ ذیل میں درج ہے جو ڈاکٹر تنویر احمد علوی ایم۔اے۔پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ اسلامیہ دہلی نے "نوائے ادب" بمبئی کی ماہ جولائی ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں شائع کرایا ہے۔

شاہ سعد اللہ گلشنؔ

|

خواجہ ناصر عندلیبؔ

|

خواجہ میر دردؔ

|

میر محمدی مائلؔ

|

شاہ نصیر

|

حافظ غلام رسول شوقؔ — نواب الٰہی بخش خان معروفؔ — شیخ ابراہیم ذوقؔ — بہادر شاہ ظفرؔ — مومنؔ

شیخ ابراہیم ذوق

|

بہادر شاہ ظفر نواب مرزا داغ مولوی محمد حسین آزاد ظہیر دہلوی انور دہلوی

نواب مرزا داغ

|

اقبال نواب سائل نوح ناروی ناطق گلاوٹی بیخود دہلوی آغا شاعر قزلباش

حضرت شاہ سعد گلشن کے حالاتِ زندگی کے تعلق سے مذکورہ کتاب کے [فٹ نوٹ] میں" لکھا ہے کہ حضرت شاہ گلشنؒ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی زبیرؓ کی اولاد میں تھے۔ آپ کا خاندان گجرات ہوتا ہوا برہان پور آیا تھا۔ آپ کی ولادت اور تعلیم و تربیت برہان پور میں ہوئی۔ عالمِ شباب میں حج کیا۔ چالیس سال کی عمر میں دہلی جاکر سکونت اختیار کی۔ حضرت مجدد ثانی کے پوتے حضرت گل کے مرید بنے۔ جن کا تخلص وحدت تھا۔ حضرت شاہ سعد للہ گلشنؒ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ جن کا کلام ایک لاکھ اشعار پر مشتمل ہے۔ ۱۱۴۰ھ میں دہلی وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔" [۱۲تا۱۶]

اس اقتباس سے جہاں قدیمی فاروقیہ سلطنت کے دارالخلافہ برہان پور دارلسرور کی اردو شاعری کی قدامت بخوبی ظاہر ہوتی ہے وہیں یہاں کے روحانی بزرگ اور شاعر قدوۃ السالکین حضرت شاہ باجنؒ کی شاعرانہ عظمت اور آپ کی بزرگی بھی اچھی طرح اجاگر ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ شاعری کے سلسلے میں عظیم المرتبت شعراء کے قابلِ احترام استاد حضرت شاہ سعد اللہ گلشن سے قریب ڈھائی سو سال پہلے حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ برہان پور میں ہندوی، گجری اور فارسی میں ایسی شاعری کر رہے تھے جو خاص و عام میں مقبول تھی۔ اور بقول ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی [اور ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم] اس زمانے میں قوالانِ خوش گفتار آپ کا کلام گایا کرتے تھے۔

شاہ رحمت اللہ رے منجھ پیہ پلاؤ

تم باج لاگے کس کے پاؤں [باؤں]

حضرت شاہ باجنؒ کا سنِ ولادت باسعادت ۷۹۰ھ\۱۳۸۹ء اور سنِ وصال ۹۱۲ھ\۱۵۰۷ء ہے اور حضرت شاہ سعد اللہ کا سنِ ولادت باسعادت برہان پور ہے]

حضرت شاہ سعد اللہ گلشنؒ شہر برہان پور میں تعلیم و تربیت پا کر چالیس سال کی عمر میں یہاں سے دہلی گئے تھے۔ مطلب یہ کہ شاہ سعد اللہ نے برہان پور دار السرور میں اپنی عمر عزیز کے چالیس سال بسر کئے تھے۔

یہ بھی عجیب اور دلچسپ اتفاق ہے کہ اردو کی قدیم شاخ زبانِ گجری کے قدیم اور عظیم شاعر حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ نے بھی اپنی عمر عزیز کے چالیس برس برہان پور دار السرور میں بسر کئے ہیں۔ جس کی تفصیل میں نے اپنے مضمون "شاہ بہاؤالدین" میں" لکھی ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہیکہ حضرت شاہ باجنؒ جب یہاں اپنے ملفوظات "خزانہ رحمت" کی صورت میں تحریر فرما رہے تھے تو ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا چراغ بھی نہیں جلا تھا۔

جن کے [مغلوں کے] عہد کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ دہلی میں ان کے عہد میں ایک مخلوط بولی پیدا ہوئی۔ جو آگے چل کر ہم سب کی پیاری زبان "اردو" کہلائی۔

اردو زبان کا جنم ہندوستان میں کب ہوا ہے؟ اس سلسلے میں ایک عرصہ دراز سے تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ اور باتوں کی طرح تحقیق میں بھی رائے' خیال اور نظریئے کے اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔ انسان کی شکل و صورت اور اطوار اور سیرت و کردار میں جس طرح قدرتی طور پر فرق ہوتا ہے اسی طرح کسی بھی بات کی تحقیق و جستجو میں فرق ہونا قدرتی بات ہے۔

نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ رائے' خیال اور نظرئے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور تحقیق کے طریقے بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔ یہی بات مذکورہ سوال کے تعلق سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ کہ اردو زبان کا جنم ہندوستان میں کب ہوا ہے؟ انیسویں صدی کے آخر تک تو یہی کہا جاتا رہا ہے کہ یہ زبان مغل شہنشاہ اکبر اور شاہ جہاں کے عہد میں مختلف زبانیں بولنے والوں کے میل جول سے وجود میں آئی ہے۔ پھر یہ کہا جانے لگا کہ اردو کی پیدائش کا زمانہ ہند میں مسلمانوں کی آمد کا زمانہ

ہے۔ بیسویں صدی میں اس زمانے میں سائنٹیفک طریقے پر تحقیقی طریقے پر کام ہوا تو پروفیسر محمود شیرانی نے پنجاب کو اردو کا پہلا وطن قرار دیا۔ اور ڈاکٹر مسعود حسن خان نے اردو کو دو آبہ گنگ و جمن کی پیداوار بتایا۔ اور مولانا سیّد سلیمان ندوی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو مخلوط زبان کی حیثیت سے سب سے پہلے سندھ میں وجود میں آئی۔

مذکورہ محققین حضرات کے تعلق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان عظیم المرتبت عالموں اور ادیبوں نے اپنے اپنے نظریے کی وضاحت کے لئے سیاسی، سماجی اور تجارتی اسباب کو بنیاد بنایا ہے۔ اور جانچ پڑتال کی گئی ہے وہ علمِ لسانیات کی روشنی میں کی گئی ہے۔ [بحوالہ ''سخنورانِ گجرات'' ۲۱۔۲۲]

سندھ میں اردو زبان مخلوط بولی کی حیثیت سے سب سے پہلے وجود میں آئی۔ اس سلسلے میں ''سخنورانِ گجرات'' کا یہ کہنا ہے کہ ''سیاسی، تجارتی، معاشرتی اور مذہبی نقطہ نظر سے غیر زبانیں بولنے والوں کا ہند میں پہلا مرکز سندھ ہے۔ یہ اپنی بندرگاہوں کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ بحری اور بری راستوں سے بیرونی ممالک سے سوداگر یہاں مال لے کر آیا کرتے تھے۔ بغداد، بصریٰ اور ایران کی بندرگاہوں سے جہاز چلتے تو سندھ ہوتے ہوئے گجرات آتے۔ اور گجرات سے مالا بار کی طرف بڑھ جاتے۔ سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو سنہ ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کے حملے کے بعد سندھ میں عربوں کی سلطنت قائم ہوگئی۔ اس سے پہلے بھی غیر زبانیں بولنے والوں کے اختلاط کا ایک سبب یہ تھا کہ کبھی تو شاہانِ ایران مکران سے سندھ تک اپنا قبضہ جما لیتے اور کبھی سندھ کے راجا بلوچستان اور مکران پر اپنا پرچم لہرا دیتے۔ اسی طرح فارسی بولنے والوں کا سندھ کی وادی میں کافی عمل دخل رہا۔ اس بارے میں مولانا سیّد سلیمان ندوی نے اپنے مقالے ''ہندوستان میں ہندوستانی'' میں مفصل اظہارِ خیال کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

عربی، فارسی بولنے والے تاجر پہلے سندھ کی بندرگاہوں پر دم لیتے تھے۔ سنہ ۷۱۱ء میں مسلمانوں نے سندھ پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ سندھ کے پنڈتوں نے بغداد جاکر ہندی سے عربی زبان میں کتابوں کے ترجموں کے کام میں حصہ لیا۔ سندھ میں مسلم حکومت تین سو سال قائم رہی۔ نیز تاجروں اور مسافروں کی آمدورفت کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مقامی بولیوں میں عربی، فارسی کا میل ہونے

سے نئی زبان وجود میں آئے۔اور آخر میں یہی سندھی 'ملتانی' پنجابی بولیاں دہلی کی زبان سے مل کر ایک معیاری زبان بن گئی۔اور اس کے بعد مختلف صوبوں میں پھیل گئی۔" [۲۰]

پنجاب اردو کا پہلا وطن ہے کے تعلق سے بھی کتاب مذکور میں لکھا ہے کہ "پنجاب میں بھی میں بھی سیاسی' سماجی حالات ایک بازاری بولی کے متقاضی تھے۔ سنہ ۱۰۲۱ء/۴۱۳ھ میں محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کر کے اسے غزنی کے ایک صوبے کی حیثیت دے دی تھی۔اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد سیاسی محکمے 'عملے 'فوجیں 'عہدے دار' تاجر 'اہلِ حرفہ سبھی پنجاب میں وارد ہوئے۔اور بیشتر نے اسے اپنا وطن بنالیا ہوگا۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ غزنوی فوج میں مختلف زبانیں بولنے والے موجود تھے۔اس میں افغانی 'خراسانی 'ہندی ہر قوم وملک کے لوگ تھے۔ لیکن لشکر میں تقریباً فیل بان ہندی تھے۔غیر زبان بولنے والوں نے پنجاب کی مقامی رائج وقت زبان اختیار کرلی ہوگی۔ تاہم مخلوط زبان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ہندی کے ترجمانوں کی ایک جماعت غزنہ میں موجود تھی۔ سیکڑوں کی تعداد میں سندھی غزنہ میں بغرضِ ملازمت اور تجارت رہتے تھے۔ پنجاب میں حکومت قائم ہونے کے بعد سماجی حیثیت سے بھی لوگوں کے آپس کے میل جول سے ایک مخلوط بولی کے رائج ہونے کے امکان کم نہ تھے۔مذہبی نقطہ نظر سے بھی صوفیا کا ورود مخلوط بولی کے ابھرنے کے امکان میں اضافہ کرتا ہے۔ حضرت علی ہجویری پہلے صوفی و عالم ہیں جنھوں نے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی۔اور سن ۱۰۷۳ء/۴۶۶ھ میں وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ پنجاب میں دوسری مقتدر ہستی بابا فرید گنج شکرؒ کی تھی۔ مخلوط زبان میں آپ کا کلام بھی ملتا ہے۔[۲۱]

پروفیسر محمود شیرانی کے نظریے کو مرحوم ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی نے تسلیم تو کیا ہے مگر آپ نے اسے دوسرے پیراگراف میں یہ کہتے ہوئے موڑ دیا ہے کہ "غرض اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پنجاب میں کوئی مخلوط بولی وجود میں آئی۔ مگر سلطنت دہلی کے قیام کے بعد جو سیاسی و سماجی انقلاب آیا اس سے اس مخلوط بولی کی ترقی ماند پڑ گئی۔اور یہ دہلی کی مخلوط بولی کی معاون بن کر رہ گئی۔" [۲۱]

اسی طرزِ استدلال کو کام میں لاتے ہوئے آگے چل کر ڈاکٹر مدنی مرحوم نے اردو زبان کے سلسلے میں دہلی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اردو کے سلسلے میں سلطنتِ دہلی کا قیام و استحکام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سنہ ۱۱۹۶ء میں معزالدین [محمد غوری] نے دہلی کو فتح کر کے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اور خود غزنہ لوٹ گیا۔ سنہ ۱۲۰۶ء میں معزالدین کی وفات پر قطب الدین دہلی کا پہلا خود مختار بادشاہ بنا۔ مسلم حکومت، قائم ہونے کے بعد یکے بعد دیگرے کئی خاندان بر سرِ اقتدار آئے۔ سب کے آخر میں سنہ ۱۵۲۶ء سے مغلیہ حکومت کا دور شروع ہوا۔ جس کی آخری شمع سنہ ۱۸۵۷ء میں گل ہو گئی۔

مسلمانوں کی سلطنت کے قیام کے بعد دہلی میں صوفیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت نصیر چراغ دہلی، وغیرہ وہ مقدس بندے تھے جن کے پرتو اور توجہ سے ہزاروں دل نورِ الٰہی سے معمور ہو گئے۔ اور انھیں کی خاص توجہ سے مخلوط بولی بھی پنپنے لگی۔

دہلی میں مخلوط بولی کی داغ بیل تو اسی روز پڑ چکی تھی جب وہاں حکومت کی داغ بیل پڑی۔ تیرہویں صدی ہند کی اپ بھرنش زبانوں کا آخری دور تھا۔ اور جدید ہند آریائی زبانوں کے روپ اوپر آ رہے تھے۔ سیاسی الٹ پھیر میں لسانی نقطہ نظر سے عربی، فارسی ترکی کا عنصر اضافی چیز ہوئی۔ مقامی زبانوں میں مل ملا کر اس عنصر نے ایک نئی بولی کا روپ لے لیا۔ اس کو کھڑی کا نام دیجئے یا ہریانی کے غالب عنصر کی وجہ سے ہریانوی کہیے۔ اسی کو بعد میں دہلوی نام عطا کیا گیا۔

مخلوط روپ صوفیا کے اقوال اور فقروں کی شکل میں ملتا ہے۔ اسی طرح کتبِ تواریخ اور لغات کی مدد سے اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس کی ایک شکل بھگتی تحریک کے شاعروں میں بھی مل جاتی ہے۔ یہ روپ، پنجابی اور ہریانوی سے بہت متاثر ہوا۔ غرض ایک مخلوط بولی دہلی میں ترقی کرتی گئی۔'' [۲۲ سخنورانِ گجرات]

یہ سبھی نظریے ہمارے ایسے عظیم المرتبت اور نامور عالموں اور ادیبوں کے ہیں جنھیں ہم نہایت عزت و احترام سے دیکھتے ہیں اور جن کے تبحر علم، وسعتِ مطالعہ اور گراں قدر ادبی خدمات سے ہم

اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے یہ صد احترام بزرگ ادبی خدمات خلوصِ دل سے انجام دیتے رہے ہیں۔ اور انھوں نے اردو کے جنم کے تعلق سے بھی یہ نظریۓ' برسوں کی تلاش و جستجو اور تحقیق کے بعد' پوری ایمانداری کے ساتھ سوچ بچار کر کے پیش کئے ہیں۔ یہ ہماری انتہائی خوش نصیبی ہے کہ یہ نظریۓ آج ہمارے سامنے گراں قدر مقالات اور تصانیف کی شکل میں موجود ہیں۔

ان سبھی نظریوں کی دل سے قدر کرتے ہوئے میں جب بھی ان پر غور کرتا ہوں تو مجھے ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ ان سب نظریوں میں بقول ڈاکٹر مدنی مرحوم "بڑی حد تک اصلیت اور حقیقت کی جھلک پائی جاتی ہے۔"

مذکورہ محققین حضرات نے اپنے اپنے نظریات پیش کرنے کے لئے جو طرزِ استدلال اختیار کیا ہے اور جو کسوٹی مذکورہ نظریات کو پرکھنے کی تیار کی ہے۔ اور جن اسباب کو مخلوط زبان کے پیدا ہونے کی وجہ قرار دیا ہے اس کے پیشِ نظر ڈاکٹر مدنی مرحوم نے گجرات کے دعوے کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اردو کی پیدائش کے متعلق مختلف نظریوں کے جائزے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مقامی زبان کے عنصر اور عربی' فارسی اور ترکی زبانوں کے عناصر کے اختلاط کی وجہ سے مخلوط بولیاں بعض علاقوں میں وجود میں آئیں۔ ان میں غیر زبانوں کے عنصر مشترک ہیں۔ اور مقامی زبانوں کے عنصر میں بھی تھوڑا تھوڑا اشتراک اور قدرے مماثلت ضرور ہے۔

گمان غالب ہے کہ دہلی میں کھڑی بولی کا روپ ابھرا تو پنجاب کی مخلوط بولی اس میں ضم ہو گئی۔ اس طرح علاؤالدین کی فتح گجرات کے بعد شمال سے گجرات کے تعلقات گہرے ہو گئے۔ اس وجہ سے عربی' فارسی عنصر کا گجرات کی مخلوط بولی میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اور آگے چل کر مخلوط دہلوی بھی آ گئی۔ دہلوی اور گجری کے لسانی عناصر میں بہت زیادہ مماثلت تھی۔ لہٰذا ان دونوں کے اختلاط کی وجہ سے ایک بولی نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ جس نے ارتقائی مدارج طے کر کے اردو کے نام سے ہندوستان کی ایک موقر زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔" [۲۵]

گجرات کے دعوے کو پیش کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے بہت کچھ تفصیل سے کام لیا

ہے۔اور یہ سب تفصیلات غور وخوض کرنے پر یہ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔اس کے باوجود ڈاکٹر صاحِب نے نہایت انکساری کے ساتھ لکھا ہے کہ ''گجرات کے بارے میں اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ تحقیق طلب ہے۔اس بارے میں ماہرینِ لسانیات کی رائے وقیع سمجھی جاسکتی ہے۔'' [۴۵]

اتنی تفصیلات کے بعد ان بیش بہا معلومات کے پیش نظر میں حضرت شاہ باجنؒ سے متعلق چند ایسی باتیں کہنا چاہتا ہوں جو اردو زبان کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر پہلے میں آپ [حضرت شاہ باجنؒ] کے حالاتِ زندگی کی کچھ اہم باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ حضرت شاہ باجنؒ کے حالاتِ زندگی آپ کے ذہن میں تازہ ہو جائیں۔

حضرت شاہ باجنؒ کی ولادت باسعادت ۷۹۰ھ میں احمد آباد [گجرات] میں اس وقت ہوئی جب یہ شہر آباد نہیں ہوا تھا۔اس شہر کو نئے سرے سے گجرات کے بادشاہ احمد شاہ [۱۴۱۱-۱۴۴۲ء] نے آباد کیا اور اسے اپنی سلطنت کا صدر مقام بنایا تھا۔اس زمانے میں گجرات کے علاقوں میں گجری زبان عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔اس کی حیثیت گجرات میں مقامی بولی کی تھی۔ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی مرحوم کے لکھے مطابق گجراتی زبان میں گجری گڑیا کو کہتے ہیں۔جس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک دیا ہوتا ہے۔زبان کا نام سن کر ذہن گجری یعنی بازار کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

حضرت شاہ باجنؒ کے آباواجداد حجاز کے رہنے والے تھے۔ مگر ان کے جدِ امجد عبدالملک اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ دہلی آگئے تھے۔یہاں بادشاہِ وقت نے اپنی بیٹی عبدالملک سے بیاہ دی۔کچھ مدت کے بعد عبدالملک کے والدِ بزرگوار مولانا احمد مدنی حجاز لوٹ آئے۔اور عبدالملک نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

عبدالملک کی تیسری پشت میں حاجی معزالدین کی ولادت ہوئی۔وہ اپنے آبائی وطن حجاز جانے کے لئے دہلی سے روانہ ہوئے۔ مگر احمد آباد کی آب وہوا پسند آنے پر انھوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

۷۹۰ھ میں حضرت شاہ باجنؒ کی ولادت احمد آباد میں ہوئی۔جب آپ کے والدِ بزرگوار احمد آباد تشریف لائے تھے۔تو آپ یہاں کی مقامی بولی گجری سے ناواقف تھے۔ لیکن آپ نے احمد آباد

کی طرح یہاں کی گجری زبان کو بھی اپنالیا۔اور آپ نے حضرت شاہ باجنؒ کی ولادت سے پہلے گجری میں دسترس حاصل کرلی۔اور عربی فارسی کی طرح اس کے بھی عالم فاضل ہوگئے۔ابھی شاہ باجنؒ کی عمر چار سال کی تھی کہ آپ کے والدِ بزرگوار معزالدین شہید کردیۓ گئے۔

شاہ باجنؒ کی ابتدائی تعلیم احمد آباد میں آپ کی والدہ محترمہ کے زیرِ اثر ہوئی۔ظاہری علوم حاصل کرنے کے بعد آپ باطنی علوم کی طرف رجوع ہوۓ۔اور آپ نے اس زمانے کے مشہور اور ممتاز روحانی بزرگ حضرت شیخ مخدومؒ [متوفی ۲ ۷ جمادی الاول ۸۶۷ھ] مزار شریف کنارے سابر متی احمد آباد ابنِ حضرت شیخ عزیزاللہ متوکل [متوفی ۸۵۳ھ مدفون مانڈو مدھیہ پردیش] سے شرَف مریدی حاصل کرلیا۔کئی برس آپ نے اپنے پیرومرشد کی خدمت میں گزارے۔

پھر آپ سیر وسیاحت کرتے ہوۓ خراسان پہنچ گئے۔آپ وہاں سے مکہ معظمہ جانا ہی چاہتے تھے کہ خواب میں بشارت ہوئی اور آپ واپس احمد آباد آگئے۔

جب آپ خراسان ہی میں تھے کہ آپ کے پیرومرشد کی رحلت ہو چکی تھی۔احمد آباد واپس آنے کے بعد ایک دِن آپ اپنے پیرومرشد کے مزار شریف پر فاتحہ خوانی کے لئے گئے تو پیرو مرشد کے بھتیجے شیخ عطااللہ نے آپ کو خرقۂ خلافت اور فرمانِ اجازت دے دیا جو آپ کے پیرو مرشد نے آپ کے لئے ان کے پاس امانتاً رکھا تھا۔

شاہ باجنؒ نے یہ مقدس تحفہ اپنے پیرومرشد کے مزار کے پاس رکھا اس موقع پر قوالوں نے آپ [حضرت شاہ باجنؒ] کا کلام گانا شروع کیا' اور جب قوال نے یہ شعر پڑھا کہ:

شار رحمت اللہ منجہ پیہ ملاوَ

تم باج لاگوں کس کے پاوَ [پاؤں]

تو شاہ باجنؒ ہی نہیں بلکہ سبھی حضرات کو جو وہاں موجود تھے 'ایسا محسوس ہوا کہ قبر سے یہ آواز آئی۔

باجن لاگے تیرے پاوَ [پاؤں]

اس وقت سے آپ باجن کے لقب اور تخلص سے مشہور ہوگئے۔

شاہ باجنؒ کو شعر و سخن سے بہت شغف تھا۔ اس لئے بہت ہی کم عمری سے آپ نے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ آپ فارسی کے علاوہ ہندی اور گجری میں بھی شعر روانی کے ساتھ کہتے تھے۔ جنہیں سن کر حاضرین جھوم اٹھتے تھے اور تڑپ کر بہ حالتِ وجد رقص کرنے لگتے۔ جیسا کہ صوفیا کی مجلس میں جکریاں گانے اور سننے کے بعد اللہ کے چاہنے والے تڑپ اٹھتے۔ اور بہ حالتِ وجد رقص کرنے لگتے ہیں ویسے ہی حضرت شاہ باجنؒ کے اشعار سن کر مریدوں اور عقید مندوں پر گہرا اثر ہوتا تھا۔ اضطراری کیفیت سب پر طاری ہو جاتی۔ اور سبھی تڑپ کر رقص کرنے لگتے۔ حضرت شاہ باجنؒ چشتیہ سلسلے کے روحانی بزرگ اور ولیؒ کامل تھے۔ اس لئے آپ کی مجلسوں میں جکریاں گانے کا رواج تھا۔

حضرت شاہ باجنؒ کی نظر میں ہندی، ہندوی اور گجری ایک ہی زبان تھی۔ آپ ان زبانوں کو الگ الگ زبانیں نہیں مانتے تھے۔ آپ اپنے کلام کو ہندی، ہندوی اور گجری کہتے تھے۔

خراسان سے واپس آنے کے بعد آپ نے کچھ دن احمد آباد میں عبادت اور ریاضت میں گزارے۔ پھر آپ حضرت برہان الدین غریبؒ کے روضے کی زیارت کے لئے دولت آباد گئے۔ پھر آپ نے بیدر جاکر حضرت منصور زماں مسعود کے روضے کی زیارت کی۔ یہاں آپ کو جانشین سے خرقہ عطا ہوا۔ اور آپ احمد آباد واپس آگئے۔ یہاں آٹھ برس تک گوشہ نشین رہ کر آپ نے سخت ریاضت کی۔ اور پھر آپ خواب میں بشارت پاکر برہان پور کے لئے روانہ ہوئے۔

۸۷۲ھ کے لگ بھگ جب شاہ باجنؒ برہان پور تشریف لائے تھے تو یہاں فاروقیہ سلطنت کے پانچویں فاروقی بادشاہ عینا عادل خان [۹۰۷ھ۔۸۶۱ھ] ابنِ مبارک فاروقی [۸۶۱ھ] کی حکومت تھی اسی بادشاہ نے ۸۶۱ھ میں بادشاہ بننے کے بعد برہان پور کو فاروقیہ سلطنت کا صدر مقام مقرر کیا تھا اور شہر میں تاپتی ندی کے کنارے شاہی قلعہ اور دیگر شاہی عمارتیں تعمیر کروائی تھی۔ شاہ باجنؒ برہان پور کے ۸۰۶ھ میں نئے سرے سے آباد ہونے کے قریب چھیاسٹھ سال بعد یہاں تشریف لائے تھے۔ بادشاہِ وقت نے آپ کی شایانِ شان پذیرائی کی اور بعد میں آپ کے لئے گھر، خانقاہ اور مسجد تعمیر کروائی گئی۔

اپنی خانقاہ میں شاہ باجنؔ طالبانِ علم و عرفان کو رشد و ہدایت دینے کے ساتھ صبح و شام درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھتے۔ اور فرصت کے اوقات میں اپنے ادبی مشاغل جاری رکھتے ہوئے ملفوظات بھی تحریر فرماتے۔ دھیرے دھیرے آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اور آپ کی دلکش اور گنگا جمنی شاعری برہان پور کے علاوہ آس پاس کے علاقوں میں بھی گونجنے لگی شاہ باجن کا شمار ملک کے عظیم المرتبت صوفیاء کرام میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی عمر کے چالیس برس برہان پور میں گذارے اور ۱۴ ذی قعد ۹۱۲ھ / ۱۵۰۸ء کو آپ کا وصال ہوا۔

شاہ باجنؔ نزد شاہ بیچگوں محبوب شد

سالِ تاریخِ وفاتش در حروف "خوب شد" [۹۱۲ھ]

شاہ باجنؔ در زمانش قطب بود

رخت خود را چوں بسوئے حق ربود

از سرِ افسوس شد تاریخِ آں

شاہ باجنؔ عاشقِ اللہ بود ۹۱۱+۱=۹۱۲ھ

آپ کی رحلت پر ایک عدد تدخلہ سے مذکورہ تاریخ رحلت کسی شاعر نے کہی ہے۔ سنگین گنبد بنا ہوا ہے۔ جو گجرات کے بادشاہ محمود بیگڑے کے حقیقی نواسے ہمایوں اعظم [۹۲۶ھ۔۹۰۷ھ] فاروقی بادشاہ نے تعمیر کروایا ہے۔ مزار کے دروازے کی پیشانی پر خود باجنؔ کا ایک قطعہ منقوش ہے:

اے پسر روئے تاب از نظرِ درویشاں

کہ نظر ہوئے بیابی زدر درویشاں

ظلمِ اعدا چو رود در درویش در آ

کہ مرادت بیابی زور درویشاں

برہان پور میں آپ کی درگاہ آج بھی زیارت گاہِ خاص و عام بنی ہوئی ہے۔

شاہ باجنؔ جب احمد آباد سے برہان پور کے لئے چلے تھے تو گجرات میں ایک مخلوط بولی وجود میں

آچکی تھی۔ لیکن اردو زبان کا جنم نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی مخلوط بولی نے ادبی شکل اختیار کی تھی۔
۸۷۳ھ کے لگ بھگ شاہ باجنؒ نے برہان پور میں اپنے ملفوظات تحریر کرنا شروع کیے۔ یہ گراں قدر ملفوظات قریب نو سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ ملفوظات "خزانہ رحمت" کے عنوان سے ہیں۔ اور اس کا ایک قدیمی اور قیمتی نسخہ برہان پور کی شاہی مسجد کے موجودہ امام اور خطیب حضرت مولوی سیّد اکرام صاحب بخاری [ابنِ ڈاکٹر حکیم سیّد شمس التوحید مرحوم] مدفون مذکورہ مسجد برہان پور کے ذاتی کتب خانہ میں موجود اور محفوظ ہے۔ ان بیش بہا ملفوظات کا اور کوئی قلمی نسخہ ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔ [تفصیل کے لئے راقم کا مضمون "خزانہ رحمت" مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی، ۲۲ دسمبر ۹۶
۱۹ء، یکم جنوری ۱۹۹۷ء ملاحظہ کیجئے]
انہی ملفوظات سے برہان پور جیسے تاریخی شہر میں ادب کی تشکیل ہوئی۔ اور گجرات [اور دکن فاروقیہ سلطنت] کی مخلوط بولی کی ادبی شکل ابھر کر سامنے آئی۔
یہ بات میں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ سہ ماہی "نوائے ادب" کے سابق ایڈیٹر اور "سخنورانِ گجرات اور "ولی گجراتی" کے مصنف ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی مرحوم نے اپنے پی ایچ۔ ڈی۔ کے مقالے میں لکھی ہے۔
اردو کی ادبی شکل کے تعلق سے لکھتے ہوئے ڈاکٹر مدنی نے اپنی کتاب "سخنورانِ گجرات" میں لکھا ہے کہ:
"پندرھویں صدی کے نصف آخر میں اردو ادبی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اور سولہویں صدی کے اوائل سے گجرات میں مستقل تصانیف کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔
اس ابتدائی دور کے مصنفین میں شاہ بہاؤالدینؒ، قاضی محمود دریائی، علی جیو گام دھنی، خوب محمد چشتی کے نام اور ادبی کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں۔" [۲۹]
مذکورہ مقالہ جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے ۱۹۴۲ء۔۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔
بعد میں یہی مقالہ "سخنورانِ گجرات" کے عنوان سے ترقی اردو بیورو دہلی کی جانب سے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا گیا۔

اس مقالے کے نگراں بمبئی یونیورسٹی کے اس وقت کے پرنسپل ڈاکٹر رحمان صاحب اور پروفیسر سیّد نجیب اشرف صاحب ندوی تھے۔ اور اس کی ادبی رہنمائی بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے فرمائی تھی۔ اور جس پر نظرِ ثانی کرتے وقت عظیم المرتبت عالم و ادیب اور محقق جناب قاضی عبدالودود مرحوم، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی مرحوم سیّد مطیع اللہ راشدؔ برہان پوری مرحوم اور پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب وغیرہم نے ادبی مشوروں سے نوازا تھا۔ اور آپ کے ادبی مشوروں کے پیشِ نظر مذکورہ مقالہ میں بقول ڈاکٹر مدنی مرحوم اتنی کانٹ چھانٹ عمل میں آئی ہے کہ مقالے نے نئی شکل اختیار کرلی۔ اور اب یہ مقالہ بدلی ہوئی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

ان سب باتوں کے پیشِ نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ "سخنورانِ گجرات" میں ڈاکٹر مدنی مرحوم نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ معتبر اور مستند ہے۔ اس سے ہمارے مذکورہ عظیم المرتبت عالموں اور ادیبوں اور ترقی اردو بیورو کے ذمہ داران کو اتفاق تھا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان کو ادبی شکل دینے والے مصنفین میں حضرت شاہ باجنؒ بلند مقام رکھتے تھے۔

پندرہویں صدی میں صرف ایک تصنیف "بحر الفضائل" کا پتہ چلتا ہے۔ اسے اردو کی ادبی تشکیل کے سلسلے میں ایک "شہادت" قرار دیتے ہوئے اس کے تعلق سے ڈاکٹر مدنی مرحوم نے لکھا ہے کہ اس کے مصنف محمد فضل اللہ بلخی کڑئی شارح مخزن اسرار نظامی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف نے گجرات کے ایک قصبہ کڑئی نامی میں مستقل اقامت اختیار کر لی ہوگی۔ اس لئے ان کے نام کے آگے کڑئی لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۴۲۴ء/۸۳۸ھ کی تالیف ہے۔ اس کے کاتب ظریف محمد بن عبداللطیف قریشی الاسدی نریاڈ [گجرات] کے رہنے والے تھے۔ [۲۶]۔

اس مذکورہ تصنیف کے علاوہ ہندوستان میں جن تصانیف کو اردو کے اوّلین نمونے قرار دیا گیا ہے وہ صرف چار ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں:

[۱] امیر خسرو سے متعلق کلام

[۲] حضرت بابا فرید گنج شکرؒ [ولادت ۵۸۴ھ وصال ۶۶۴ھ] سے منسوب کلام

[۳] حضرت جہانگیر سمنانی کا رسالہ

[۴] حضرت سیّد محمد حسینی گیسودراز کا رسالہ ''معراج العاشقین''

مگر ان تصانیف کے تعلق سے ڈاکٹر مدنی مرحوم کا یہ کہنا ہے کہ:

''لیکن لسانی نقطہ نظر سے یا کسی وجوہ کی بنا پر ان کے اصل ہونے میں شبہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔''[۲۶]

اگر یہ بات صحیح ہے، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے تحریر فرمایا ہے تو پھر اردو زبان کے اوّلین نمونوں میں حضرت شاہ باجنؒ کی تصنیف ''خزانہ رحمت'' کو ''بحر الفضائل'' کے بعد دوسرا نمبر حاصل ہو جاتا ہے۔ ورنہ اسے مذکورہ چاروں تصانیف کو ملا کر چھٹا نمبر حاصل ہے۔ یہ بات بھی شاہ باجنؒ کے عقیدتمندوں اور خاص طور پر اہلِ برہان پور کے لئے باعثِ فخر و ناز ہے کہ ان کے روحانی بزرگ اور ولیٔ کامل قدوۃ سالکین و زبدۃ العارفین حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ قدس سرہ، ہمارے ان چھ عظیم المرتبت بزرگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے زبان و ادب کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ اور جن کی گراں قدر تصانیف سے ہندوستان میں اردو زبان نے ادبی شکل پائی ہے۔

ڈاکٹر مدنی مرحوم نے ابتدائی دور کے مصنفوں کے جو اسمائے گرامی تحریر فرمائے ہیں ان میں سر فہرست شاہ باجنؒ کا نام ہے۔ آپ کے علاوہ جو چار بزرگ اور ہیں، جن کے ادبی کارنامے منظرِ عام پر آچکے ہیں وہ یہ ہیں:

[۱] قاضی محمود دریائی متوفی سنہ ۹۴۱ھ ۱۳ ربیع الاول احمد آباد تصنیف نمبر ۲

[۲] شاہ محمد جیو گام دھنی متوفی ۹۷۳ھ احمد آباد

[۳] خوب محمد چشتی متوفی ۲۴ شوال ۹۲۳ھ احمد آباد

یہ تینوں بزرگ حضرت شاہ باجنؒ کے بعد کے ہیں اور آپ کی تصانیف بھی ''خزانہ رحمت'' کے بعد کی ہیں۔ آپ کے علاوہ ایک اور بزرگ احمد کھٹو کے حالات بھی ڈاکٹر مدنی مرحوم نے تحریر فرمائے ہیں۔ آپ کی زندگی کے دلچسپ اور سبق آموز حالات لکھنے کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے آپ

کی ایک فارسی غزل اور چند دوہے گجری زبان کے درج کئے ہیں۔ مگر ان کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ کہنا مشکل ہے کہ مذکورہ بالا دوہے کسی اور شاعر کے ہیں یا خود شیخ۔۔ کہے ہیں۔" [۴۷]

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے شیخ احمد کھٹو کی کسی تصنیف کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ اس لئے شیخ صاحب موصوف "مصنفین" کی تعریف میں نہیں آتے۔ اس لئے آپ کو اردو کے ادبی نمونے والے مصنفین میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

ان سب باتوں کے پیشِ نظر اگر یہ کہا جائے کہ پندرہویں صدی کی تصانیف میں محمد فیض اللہ کڑئی کی "بحر الفصائل" کے بعد حضرت باجنؒ کی "خزانۂ رحمت" کا ہی نمبر آتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لئے ہم "خزانۂ رحمت" کو ادبی تشکیل کے سلسلے میں "دوسری شہادت" قرار دیں تو بے جا نہیں کہا جاسکتا۔

"بحر الفصائل" ۱۴۲۴ء\۸۳۱ھ میں اور "خزانۂ رحمت" ۸۷۳ھ میں لکھی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ ان کی تخلیق میں صرف ۳۵ سال کا فرق ہے۔ ان بزرگوں کی تصانیف سے متعلق اہم اور معلومات درج ذیل ہے:

[۱] "خزانۂ رحمت" کے نسخے کا مائکرو فلم ڈاکٹر مدنی مرحوم کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

[۲] قاضی محمود دریائی کی جکریوں کا ایک مجموعہ احمد آباد کے مشہدی نام کے مشائخ خاندان میں محفوظ ہے۔

[۳] شاہ صاحب کی نظموں کا ایک مجموعہ "جواہر اسرار اللہ" کے نام سے ہے۔ یہ کہاں محفوظ ہے؟ یہ ڈاکٹر صاحب مدنی صاحب نے نہیں لکھا ہے۔ "مقالاتِ شیرانی" اور "اردو کی ابتدائی نشو نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" صفحہ ۶۳ میں شاہ صاحب کے کلام کا ذکر اور تعریف ہے۔

برہان پور میں حضرت شاہ باجنؒ کی آمد
ایک سوال

حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ برہان پور دارالسرور میں کب تشریف لائے تھے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب بلا سوچے سمجھے کچھ بھی دینا تو آسان ہے لیکن تاریخی شہادتوں کی روشنی میں جواب دینا ذرا مشکل ہے۔اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ شاہ باجنؒ برہان پور کے مقبول ترین روحانی بزرگ ہیں۔ جن کا ایک زمانہ معتقد ہے۔ آپ ولایت اور قطب کے اعلیٰ روحانی فضائل رکھتے ہیں۔ علمی اور ادبی حیثیت سے بھی آپ کا رتبہ دیگر روحانی بزرگوں سے اعلیٰ وافضل ہے۔ آپ کی گراں قدر تصنیف "خزانۂ رحمت" زبان اور موضوع کے لحاظ سے ایک اہم کتاب ہے۔ جو دنیا بھر میں مشہور ہے۔اس کی وجہ سے برہان پور کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

برہان پور میں آپ کا وصال ۲۴ ذی قعدہ ۹۱۲ھ میں ہوا۔

شاہ باجنؒ نزد شاہ بیچگوں محبوب شد
سالِ تاریخ، وفاتش در حروف خوب شد

۹۱۲ھ

یہ تاریخ وفات آپ کے ایک مرید نے لکھی ہے جو بہت مشہور ہے۔

آپ کے مزار پر سنگین گنبد بنا ہوا ہے۔ جو برہان پور کے فاروقی بادشاہ اعظم ہمایوں نے تعمیر کروایا ہے۔ جس کی پیشانی پر آپ ہی کی یہ رباعی کندہ ہے:

اے پسر روئے متاب از نظر درویشاں
کہ نظر ہوئے بیابی زورِ درویشاں
ظلم اعدا چو بود در درویش در آئی
کہ مرادت بیابی زورِ درویشاں

درگاہ قریب پانچ سو سال سے زیارت گاہِ خاص وعام بنی ہوئی ہے یہ ایک حقیقت ہے جسے ہم جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ برہان پور میں کب تشریف لائے اور کتنے سال آپ نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرکے بندگانِ خدا کو باطنی فیض پہنچایا؟ اس سلسلے میں برہان پور کے قابل محققین

کی کتابیں ہماری بہت کچھ مدد کر سکتی ہیں۔ان میں مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم [متوفی حیدر آباد] کی تالیف کردہ کتاب ''تاریخِ برہان پور'' سرِ فہرست ہے۔ جو آج سے قریب نوے برس پہلے مرحوم شیخ عبدالرزاق پرنٹر کے زیرِ اہتمام کوثر پرنٹنگ میں پہلی بار چھپ کر منظرِ عام پر آئی تھی۔ کتاب کے آخر میں وہ قطعہ درج ہے جو کتاب کے مولف نے کتاب کے ختم ہونے پر کہا تھا:

حمد و شکر حضرتِ خلاق اکبر ہر دم دست

از طفیلِ رحمت العالمین عالی جناب

ختم شد تاریخِ برہان پور از حبِ وطن [۱۳۱۶]

نام تاریخ شد تاریخِ موطن از حساب

اس کتاب کادوسرا ایڈیشن دہلی کے مجتبائی پریس میں چھپا تھا۔ جواب نایاب ہے۔

اس کتاب میں حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ کے برہان پور تشریف لانے کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ''آپ بیدر سے آکر ملکِ گجرات میں پندرہ روز تشریف فرما رہے۔اس کے بعد متوجہ برہان پور ہوئے اور چند دِن مسجد خانہ پور' شہر برہان پور میں قیام فرمایا۔جب حاکمِ شہر برہان پور کو حال میں شاہ باجنؒ کی اطلاع ہوئی' شہر میں بکمال منت واعزاز واحترام ان کو لے کر آیا اور مسجد خانقاہ ان کے واسطے بنوادی۔اور خانہ پور موضع جاگیر' مصارف خانقاہ کے واسطے بادشاہ کی طرف سے مقرر ہوئے۔'' [۱۳۲۔۱۳۳]

''سلکِ گوہر'' جاوید انصاری مرحوم کی وہ یادگار تالیف ہے جو بھوپال کے ایک پریس میں ۱۹۴۸ میں چھپی تھی۔اس میں مرحوم جاوید انصاری 'شاہ باجنؒ' کے برہان پور آنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ''شیخ شاہ باجنؒ عرصے تک عرب وایران کی سیاحت کرتے رہے جب واپس آئے تو آپ کے مرشد رحمتِ حق سے واصل ہو چکے تھے۔حسبِ وصیت خرقۂ خلافت آپ کو حاصل ہوا۔شاہ صاحب نے مستقل سکونت برہان پور میں اختیار کی اور عرصے تک آپ بندگانِ خدا کو ہدایت فرماتے رہے۔'' [۹]

"تاریخ اولیائے کرام برہان پور" بشیر محمد خان [ایڈوکیٹ] کی وہ مشہور تالیف ہے جو ۱۹۹۲ء میں پونہ [مہاراشٹر] میں شائع ہوئی ہے اس میں صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ "آپؒ احمد آباد سے روانہ ہو کر موضع خان پور جو برہان پور سے سات میل جانب جنوب ہے آکر فروکش ہوئے اور کچھ عرصے تک قیام فرمایا۔ اور والیٔ برہان پور کو آپ کی آمد کا حال معلوم ہوا۔ تو مشائخ کو ہمراہ لے کر آپ کی خدمت میں کھان پور پہنچا۔ اور عذر و معذرت کر کے برہان پور لایا۔ بادشاہ نے مصارف کے لئے چند موضعات، جس میں خان پور بھی شامل تھا، جاگیر میں دیئے آپ نے اپنی بقیہ عمر برہان پور ہی میں گزاری۔ اور عام لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔ ["تاریخِ اولیائے کرام برہان پور بحوالہ افکار الابرار]۔ تقریباً یہی کتاب "برہان پور" کے مئولف معین الدین صاحب ندوی صاحب نے بھی اپنی کتاب میں کہی ہے۔ آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ "خانہ پور آئے اور وہاں کی ایک مسجد میں قیام کیا۔ برہان پور کے بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ آپ کو برہان پور بلایا۔ آپ کے لئے ایک مسجد اور ایک خانقاہ تعمیر ہوئی۔ اور وہ برہان پور جو حضرت برہان الدین غریبؒ کے زیر سایہ تھا آپ کے زیرِ سایہ آگیا۔" [۷۷]

دونوں صاحبان کے بیان میں تھوڑا فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ بشیر محمد خان صاحب مرحوم کہتے ہیں کہ "آپ احمد آباد سے روانہ ہو کر موضع خانہ پور جو کہ برہان پور سے سات میل جانب جنوب ہے میں آکر فروکش ہوگئے۔" جب کہ مولوی معین الدین مرحوم لکھتے ہیں کہ "حضرت بہاؤالدین باجنؒ خلد آباد کی خانقاہ مبارک سے خرقہ اور شجرہ لے کر مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے خانہ برہان پور تشریف لائے۔"

اس فرق کے علاوہ ہمارے معزز محققین میں کچھ اختلاف نہیں ہے۔ مگر ان میں سے ایک کی کتاب میں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ حضرت شاہ باجنؒ کس سن میں احمد آباد سے روانہ ہو کر خانہ پور اور پھر وہاں سے برہان پور تشریف لائے تھے؟ اور نہ ہی یہ لکھا ہے کہ فلاں بادشاہ نے منت و اعزاز و احترام کے ساتھ آپ کو برہان پور بلایا "یا" لایا تھا؟ تقریباً سبھی نے یہ لکھا ہے کہ "آپ

تشریف لائے تھے۔" لیکن آپ کی تشریف آوری کب اور کس کے عہد میں ہوئی تھی؟ یہ کسی نے نہیں لکھا ہے۔

اتنے عظیم ولیِ کامل برہان پور تشریف لائے۔ کئی برس بندگانِ خدا کو برہان پور میں رہ کر رشد وہدایت کی اسی سرزمین پر آپ نے آخری سانس لی' یہیں آپ کا وصال ہوا۔ یہیں آپ کو دفن کیا گیا۔ مزار پر سنگین گنبد بنایا گیا۔ قریب پانچ سو سال سے آپ کی درگاہ زیارت گاہِ خاص و عام بنی ہوئی ہے پھر ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ آپ برہان پور کب آئے تھے؟ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے اس بات کی تحقیق کی جانی چاہیے۔ اس کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ ہم پھر ایک مرتبہ آپ کے حالاتِ زندگی کی طرف رجوع ہوں اور آپ کے واقعاتِ زندگی ہی سے کچھ اخذ کر کے تاریخی شواہد کی روشنی میں اس سوال کو حل کریں کہ آپ کس سنہ میں فلاں بادشاہ کے عہدِ حکومت میں برہان پور تسریف لائے تھے۔

حضرت شاہ باجنؒ کے حالاتِ زندگی جاننے کا سب سے بڑا ذریعہ آپ کی تصنیف "خزانۂ رحمت" ہے۔ جو آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت مخدوم رحمتہ اللہ ابنِ عزیز اللہ متوکّل [مانڈوی] کے حالات ارشادات میں تصنیف کی ہے۔ اس سے استفادہ کر کے موّرخین اور محققین حضرات نے اپنی کتابیں تالیف کیں ہیں۔ جن میں شہر برہان پور کے موّرخین اور محققین بھی شامل ہیں۔ اس بے بہا تصنیف کے کتنے نسخے دستِ بردِ زمانہ سے تلف نہ ہو سکے۔ اس کے بارے میں ہمارے محققین میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ قبلہ سیّد ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی [مرحوم] نے اپنی کتاب "سخنورانِ گجرات" میں صرف دو نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے "شاہ بہاؤ الدین باجنؒ" میں ان کی تعداد پانچ بتائی ہے۔ مدنی صاب مرحوم کے حوالے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس کا ایک نسخہ اسی شہر برہان پور میں محفوظ ہے۔ جس برہان پور میں حضرت موصوف نے اسے تصنیف فرمایا ہے اور دوسرا نسخہ بٹوارے میں پاکستان کے حصہ میں آیا ہے۔ ہندوستان میں یہ نسخہ برہان پور کے مشائخ خاندان کی ایک بزرگ ہستی جناب مولوی سیّد رفیع الدین صاحب مرحوم ابن مولوی سیّد محمد بشیر الدین صاحب مرحوم کے پاس محفوظ تھا۔ جو موصوف کے انتقال کے بعد برہان پور کی شاہی جامع مسجد کے مرحوم پیش امام و خطیب حضرت مولوی سیّد احکام اللہ صاحب کی تحویل

میں دے دیا گیا تھا۔اور جو آج بھی امامِ موصوف کے نواسے اور جانشین جناب مولوی اکرام اللہ صاحب موجودہ پیش امام و خطیب شاہی جامع مسجد کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔اور ڈاکٹر شیخ فرید کے لکھے مطابق "خزانۂ رحمت" کے پانچ نسخے ہیں۔جن میں سے دو نسخے برہان پور میں ہیں۔ایک تو مولوی احکام اللہ صاحب کے پاس تھا اور ایسی امید کی جا سکتی ہے کہ اب بھی ان کے نواسے کے پاس محفوظ ہو گا۔اور دوسرا نسخہ جناب بشیر محمد خان صاحب ایڈوکیٹ مرحوم کے پاس تھا جو اب کہاں ہے کہہ نہیں سکتے۔

اس کے بارے میں مرحوم ایڈوکیٹ نے اپنی تصنیف میں صرف اتنا لکھا ہے کہ "مولوی سیّد احکام اللہ صاحب مرحوم نے کئی کتابیں مجھے دیں جن کی میں نے نقلیں کیں۔خصوصاً حضرت شاہ باجنؒ کی تصنیف "خزانۂ رحمت" جو بالکل نایاب ہے ہندوستان میں ایک یا دو نسخے اور ہیں وہ بھی مجھے عنایت کی اور اس سے میں نے پورا فائدہ اٹھایا۔" [تاریخِ اولیائے برہان پور ۱۳] مطلب یہ کہ موصوف کے پاس "خزانۂ رحمت" کا نسخہ نہیں ہے جیسا کہ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے لکھا ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان کے پاس ہوتا تو وہ اس کا ذکر اپنی کتاب میں ضرور کرتے۔[خیال رہے کہ ایڈوکیٹ موصوف کی کتاب ان کی وفات کے بعد ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔] تیسرا نسخہ "برہان پور کے سندھی اولیاء" کے مصنف علامہ سیّد مطیع اللہ راشد برہان پوری کے پاس تھا۔وہ بھی اب کہاں ہے کسی کو معلوم نہیں۔کیوں کہ ۱۹۴۸ء میں راشد صاحب مرحوم برہان پور سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے جہاں وہ ۱۹۶۰ء میں رحلت فرما گئے۔اور یہ بات یقینی ہے کہ اب وہ کس کے پاس ہے کہا نہیں جا سکتا۔مدنی صاحب مرحوم کو جناب ڈاکٹر حکیم مولوی شمس التوحید صاحب مرحوم [والدِ بزرگوار مولوی سیّد اکرام اللہ صاحب] نے یہ نسخہ دکھایا تھا۔مگر یہ وہی مولوی رفیع الدین والا نسخہ ہے یا کوئی اور نسخہ ہے کہہ نہیں سکتے۔؟گمان غالب ہے یہ مولوی رفیع الدین والا نسخہ علامہ راشد کو دستیاب ہو گیا تھا۔جس کے بارے میں ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے لکھا ہے کہ "نصف آخر یا مکمل املائی خصوصیت کے پیشِ نظر قدیم نسخہ ہے۔[۱۵] ان کے علاوہ نسخہ چہارم [نسخہ شیرانی] ہے جو اورینٹل کالج لاہور میں محفوظ ہے اور نسخہ پنجم

بابائے اردو جناب ڈاکٹر عبد الحق صاحب کو برہان پور میں ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۲ء میں دستیاب ہوا تھا۔ جواب کراچی کی زینت بنا ہوا ہے۔ اس کو زیروکس ڈاکٹر شیخ فرید صاحب کے پاس ہے۔ نسخہ لاہور کا مائکرو فلم قبلہ مدنی صاحب مرحوم کی ذاتی لائبریری [سورت] میں محفوظ تھا۔ جو موصوف نے کسی لائبریری یا کتب خانے کو دے دیا ہے۔ اس نسخے کے معنی و مطالب پر حافظ محمود شیرانی کا ایک مضمون اورینٹل کالج میگزین [نومبر ۱۹۳۰ء] اور برہان پور کے نسخے پر ڈاکٹر شیخ فرید کا مضمون "نوائے ادب [اکتوبر ۱۹۷۰ء] میں شائع ہوا تھا۔ ["سخن ورانِ گجرات صفحہ ۴۹]

حضرت شاہ بہاؤالدینؒ قدس سرہ' کے حالاتِ زندگی اس طرح بیان کئے جاتے ہیں:

آپ کا اسم گرامی شیخ بہاؤالدین اور لقب باجن ہے۔ والدِ بزرگوار کا نام معزالدین ابنِ علاؤالدین ابنِ شہاب الدین ہے۔ آپ کی ولادتِ باسعادت شہر احمد آباد [گجرات] میں ہوئی۔ جب آپ کی عمر چار سال کی تھی اس وقت آپ کے والد صاحب کی شہادت ہو چکی تھی۔ احمد آباد ہی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں آپ روحانی بزرگ حضرت مخدوم رحمتہ اللہ کے مرید ہوئے اور آپ ہی کی خدمت میں رہ کر انھیں فیض پہنچا اور آپ نے درجۂ ولایت پایا۔

آپ کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ جب آپ کے پیر و مرشد حضرت مخدوم رحمتہ اللہ کی وفات ۲۹ جمادی الاخر ۸۷۶ھ میں ہوئی اس وقت آپ خراساں سے ارادۂ حج کر کے مکہ شریف کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ دورانِ سفر ہی میں آپ کو مراقبہ میں یہ بشارت ہوئی کہ آپ نے جو ارادۂ حج کیا ہے وہ بارگاہِ خداوندی میں قبول کر لیا گیا ہے اور پیر کی بھی رحلت ہو چکی ہے اس لئے وطن کی طرف مراجعت کر جائیں۔ اس حکم پر حضرت شیخ باجن اکیس سال بعد سفر سے لوٹ کر احمد آباد آئے تب آپ کے پیر و مرشد کے بھتیجے شیخ عطاء اللہ ابنِ شیخ شہر اللہ نے وہ خرقۂ خلافت اور فرمان آپ کو دیا جو آپ کے پیر نے آپ کے لئے اپنے بھتیجے کے پاس محفوظ رکھا تھا۔

دوسرے ہی روز جبکہ آپ اپنے پیر و مرشد کی آستانہ بوسی کے لئے گئے تو آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور آپ نے جوشِ مسرت میں خرقہ اور فرمان مرشد کے مزار پر رکھ دیا اسی وقت قوالوں نے آپ کا ہندی کلام گانا شروع کیا اور جب قوال اس سخن پر پہنچے:

شاہ رحمت اللہ منجھ پیہ ملاؤ

تم باج الاگوں کس کے پاؤ[پاؤں]

اسی وقت قبر سے ندا آئی "باجن الاگے تیرے پاؤ[پاؤں]اس وقت آپ پر وجد حال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ندا آئی "بیہوش کہ حق تست" جیسے ہی آپ نے دنوں ہاتھ اونچے کئے خرقہ خود بخود جسم پر زیب تن ہو گیا۔ باجن لقب بھی اسی وقت سے مشہور ہوا۔ چند سال شاہ باجن نے شیخ عطاء اللہ کی خدمت میں گزارے[سخن ورانِ گجرات ۴۸]

"باجن" کو ہندی میں مزامیر یعنی جنتر کہتے ہیں۔ جب آپ کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہوگئی تو آپ کے پیر نے خواب میں فرمایا "تمہارا مقام شہر برہان پور ہے تمہارا وصال بھی اسی جگہ ہوگا۔" [تاریخ اولیائے کرام برہان پور ۸۴۔۸۷] یہ سن کر آپ کو بے حد مسرت ہوئی لیکن آپ کسی وجہ سے برہان پور نہ جاسکے۔ پھر ایک مدت بعد آپ کے دل میں حضرت برہان الدینؒ غریب اور حضرت زین الدینؒ، جن کے نام پر فاروقی بادشاہ ملک نصیر نے ۱۴۰۶ء مطابق ۸۰۱ھ میں شہر برہان پور اور موضع زین آباد بسایا تھا، کی زیارت کی خواہش پیدا ہوئی، تب آپ دولت آباد پہنچے۔ اس وقت روضے کے متولی شیخ جیوں نے اپنے پیر کی بشارت کے مطابق آپ کو پیر کی پشواز عنایت کی۔ اسی روز حضرت برہان الدینؒ نے آپ کے خواب میں فرمایا "تمہارا مقام برہان پور ہے جو ہم نے تمہارے حوالے کیا۔" پھر آپ بیدر کے لئے روانہ ہوئے۔ بیدر میں حضرت مسعود بیک کے خلیفہ حضرت شیخ جھجلے کی خدمت میں رہ کر آپ نے چلہ کشی کی اور مسعود بیک کا خرقہ خلافت حاصل کیا۔ پھر آپ احمد آباد[گجرات]لوٹ آئے۔ اور یہاں آٹھ سال تک گوشہ نشین رہ کر ریاضت کی۔ پھر آپ فرمان دیرینہ کے مطابق برہان پور کے لئے روانہ ہوئے۔

اس سے تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ احمد آباد سے خانہ پور آئے تھے تو آپ کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ پیر کی بشارت[تمہارا مقام برہان پور۔۔۔] کے بعد کتنی مدت تک آپ برہان پور نہ آسکے اور آپ کب حضرت برہان الدینؒ غریب کے روضے کی زیارت کے لئے دولت آباد گئے اور گجرات آئے تھے۔ اس لئے برہان پور کب آئے

یہ کہنا مشکل ہے؟

اگر یہ درست ہے کہ حضرت باجن کے پیر حضرت مخدوم رحمت اللہ کی وفات ۸۶۷ھ میں ہوئی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، تو اس وقت شاہ باجن کی عمر ۷ے کی ہونا چاہئے [کیوں کہ آپ کی وفات ۹۱۲ھ میں اور پیدائش ۷۹۰ھ میں ہوئی تھی] مگر اسے صحیح اور درست ماننے میں مشکل یہ ہے کہ مخدوم رحمت اللہ کی وفات جب ہوئی تو شاہ باجن خراساں سے روانہ ہو چکے تھے۔

سبھی تذکرہ نویسوں کا ایسا کہنا ہے کہ آپ مکہ شریف کا سفر ملتوی کر کے گجرات لوٹ آئے یہاں ایک مدت تک رہنے کے بعد آپ حضرت برہان الدینؒ کی زیارت کے لئے دولت آباد گئے اور وہاں عطا اللہ کی خدمت میں چند سال گزارے، پھر بیدر گئے۔ چلہ کشی کی اور مسعود بکی سے خرقہ حاصل کیا پھر احمد آباد آکر آٹھ سال گوشہ نشین رہ کر ریاضت کی۔ اس میں کم از کم تیرہ سال گزر گئے ہوں گے۔ مطلب یہ کہ جب آپ برہان پور تشریف لائے اس وقت آپ کی عمر نوے سال کی ہو گی۔ اس حساب سے آپ نے برہان پور میں ۲۲ سال گزارے۔ کیوں کہ آپ کی وفات ۹۱۲ھ مطابق ۱۵۰۸ء میں ہوئی تھی۔ اس کی تائید اس کتبے سے بھی ہوتی ہے جو بقول ظہیر الدین صاحب مرحوم، شاہ باجن کی مسجد میں لگا ہوا ہے ان کی تحریر کے مطابق "تعمیر سے متعلق مسجد کے کتبے پر سنہ ۸۷۷ھ درج ہے۔" [نمبر ۴۹]

اس حساب سے ۸۷۷ھ سے ۹۱۲ھ [شاہ باجن کے وصال تک] ۳۲ سال ہوتے ہیں۔ مگر قبلہ مدنی صاحب مرحوم اپنی تصنیف "سخنورانِ گجرات" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "برہان پور میں ان کی عمر عزیز کے چالیس سال گزرے۔" [صفحہ ۴۸]

یہ پانچ سال کا فرق اہمیت تو رکھتا ہے۔ مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ باجنؒ کے برہان پور آنے کے ۵ سال بعد بقول مدنی صاحب، اعظم ہمایوں نے آپ خانقاہ میں مسجد تعمیر کروائی ہو، تو چالیس سال پورے ہو جاتے ہیں۔ تقریباً یہی بات ڈاکٹر شیخ فرید صاحب بھی اپنی تصنیف "بہاؤالدین باجن" میں کہتے ہیں "اگر تعمیر مسجد، سن بنیاد ۸۷۷ھ ۵۱۴ سال قبل برہان پور میں اقامت گزینی کا شمار کریں تو تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے۔" [صفحہ ۸]۔

چالیس سال والی بات سب سے پہلے ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم [ابن سیّد حمید الدین صاحب حشمت مرحوم سورت گجرات] اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں تقریباً پچپن برس پہلے ۱۹۴۲-۱۹۴۱ء میں لکھی تھی۔ جب کہ وہ اپنے مقالے میں شاہ باجن کے حالاتِ زندگی لکھ رہے تھے۔ بعد میں یہ تحقیقی مقالہ "سخن ورانِ گجرات" کے عنوان سے شائع ہوا۔ موصوف نے اپنی بات کے لئے شاہ باجن کی مسجد میں لگے کتبے کو بنیاد بنایا ہے۔ مگر ڈاکٹر فرید صاحب نے اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے کہ انھوں نے اسے کہاں دیکھ کر لکھا ہے؟ حالانکہ جہاں تک خیال گزرتا ہے یہی بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے یہ بات مدنی صاحب کی کتاب "سخنورانِ گجرات" اور برہان پور کے مایہ ناز عالموں کی گراں قدر تصانیف کو دیکھ کر ہی لکھی ہے۔

جناب بشیر محمد خان صاحب ایڈوکیٹ نے بہت پہلے ان کتبوں کے بارے میں تحقیق کر کے یہ لکھا ہے کہ مغربی رخ پر ایک شان دار مسجد ہے جس پر گنبد بنے ہوئے ہیں 'کچھ شکستہ ہو کر گر پڑے اس کی از سرِ نو مرمت ہو کر گنبد بنائے گئے۔ یہ مسجد اعظم شاہ ہمایوں فاروقی نے اپنے دورِ حکومت میں بنوائی تھی۔

ایک کتبہ مسجد میں ہے اور دوسرا کتبہ احاطہ کے جنوبی رخ کے دروازے میں لگا ہوا ہے۔ [کتاب تاریخِ اولیائے کرام برہان پور نمبر ۹۱] اور جناب مولوی معین الدین صاحب ندوی مرحوم نے اپنی کتاب "برہان پور" میں لکھا ہے کہ "حضرت شاہ بہاؤالدین کی مسجد واقع شاہ بازار برہان پور میں عادل شاہ فاروقی بانیٔ جامع مسجد برہان پور کے اعظم ہمایوں عادل خان کا فارسی زبان میں ایک کتبہ جو خطِ شکستہ میں تحریر ہے، مگر اندازِ تحریر اس قدر پیچیدہ ہے کہ اس کا حل جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔"

اور میں نے کہا "میں ایک آدھ لفظ کیا میں تو پورا کتبہ حل کر چکا ہوں میں نے اسے اتنی مرتبہ پڑھا ہے کہ میں پیٹھ کر کے پڑھنا شروع کرتا ہوں اور آپ کتبے کو غور سے دیکھ کر میرے الفاظ کو کتبے کی عبارت سے ملاتے جایئے۔ چنانچہ میں نے کتبے کی پوری عبارت پڑھ کر سنائی اس کا مطلب سمجھا دیا اور کتبے کا تاریخی پس منظر بھی بتا دیا۔ [صفحہ ۵۹-۶۰]

عیسائیوں کی مذہبی زبان ہے۔جس میں انجیلِ مقدس نازل ہوئی یہاں عبرانی زبان کا صرف ایک کتبہ ہے جو برہان پور کی خطیرہ فاروقیہ [شاہی قبرستان] کے پاس کسی عیسائی کی قبر ہے قبر مذکورہ پر صلیب کے نشان + کے نیچے عبرانی زبان میں ایک عبارت تحریر ہے جس کا رسم الخط عبرانی ہے سنسکرت زبان کے صرف دو کتبے ہیں جو جامع مسجد برہان پور اور جامع مسجد اسیر گڑھ میں موجود ہیں ہندی کے بھی دو کتبے ہیں ان میں سے ایک کتبہ شہنشاہ جہان گیر کے دور کا ہے۔جو برہان پور میں دریائے تاپتی کے کنارے پر ہے۔دوسرا شاہجہان کے دور کا ہے جو اسیر گڑھ کے قلعے میں فارسی کتبے کے ساتھ ہے۔

یہ اقتباس میں صرف اس لئے دے رہا ہوں کہ آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ مولوی صاحب مرحوم ان کتبات پر بہت پہلے تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

اب قارئین کی دل چسپی کے لئے میں "سخن ورانِ گجرات" کی وہ عبارت لکھ رہا ہوں جسے ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی مرحوم نے تحریر فرمایا ہے:

"حضرت شاہ باجن کا مزار مقام شاہ پورہ [سہوکار بازار] میں واقع ہے۔اس کے متصل اعظم ہمایوں سلطان فاروقی [سلطان محمود بیگڑے کے حقیقی بھانجہ] نے ایک عالی شان مسجد تعمیر کرادی۔تعمیر سے متعلق مسجد کے کتبے پر سنہ ۸۷۷ درج ہے۔[نمبر ۵۰]

اسے ماننے میں دقت یہ ہے کہ قبلہ مدنی صاحب مرحوم نے اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔اور نہ ہی یہ لکھا ہے کہ انھیں یہ خیال مذکورہ کتاب دیکھنے کے بعد آیا۔دوسری بات یہ ہے کہ مدنی صاحب مرحوم نے مزار سے متصل مسجد لکھی ہے،جو صحیح نہیں ہے۔

شاہ باجن کا مزار احاطہ کے شمال مشرق کے گوشے میں ہے جب کہ شاہ باجن کے مقبرے سے قریب سو قدم کے فاصلے پر مغربی رخ پر مسجد ہے۔

اس کے علاوہ مدنی صاحب مرحوم نے اعظم ہمایوں کو فاروقی اور سلطان محمود بیگڑا کا حقیقی بھانجہ لکھا ہے۔یہ بھی صحیح نہیں ہے۔اعظم ہمایوں،جس کا پورا نام عادل خان بن حسن خان بن نصیر خان مقلب اعظم ہمایوں ہے۔احمد آباد [گجرات] کے بادشاہ فتح خان عرف محمود بگیڑا [ابن محمد شاہ] کا

حقیقی بھانجہ نہیں نواسہ تھا۔ اور وہ اس زمانے میں فاروقی سلطنت پر متمکن بھی نہیں تھا۔ جس زمانے میں مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ لیکن وہ حکمراں فاروقی خاندان کا شہزادہ ضرور تھا۔ اور وہ حضرت شاہ باجنؒ کا معتقد بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے شاہ باجنؒ کے احاطہ میں شہزادے کی حیثیت سے مسجد بنوائی ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟ پھر اسے ماننے سے تامل کیوں ہے؟ مگر اسے ماننے سے تامل اس لئے ہے کہ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب کی کتاب "شاہ بہاؤ الدین باجنؒ" کے مقدمے میں ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے ایک غلطی کا ازالہ کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا ہے کہ بقول مدنی صاحب باجنؒ کے مزار سے متصل برہان پور کے بادشاہ اعظم ہمایوں نے ایک شان دار مسجد تعمیر کی ہے' یہ صحیح نہیں ہے۔" [نمبر ۸] ان کے لکھے مطابق مسجد کا بانی ملک الشرق تاج بن کیلا نے شاہ صاحب کے لئے ایک مسجد اور خانقاہ وغیرہ ۷۷۸ھ میں تعمیر کروائی تھی۔ [نمبر ۱۲] اس سلسلے میں ڈاکٹر ڈیسائی کا یہ بھی کہنا ہے کہ شاہ باجنؒ کے موجودہ مزار کے احاطے میں واقع مسجد ان کے لئے تعمیر ہوئی۔ اس کی حقیقت یا بنیاد نہیں ہے۔ مذکورہ ملک الشرق تاج بن کیلا کا پکا مزار حضرت باجن کے مقبرے کے سامنے [جنوبی رخ پر] جو چبوترا ہے اس پر بنا ہوا ہے۔ تاج بن کیلا فاروقیہ بادشاہ اعظم ہمایوں کے عہدِ کے وزیر تھا۔ اس مسجد کی تعمیر یا اس کے ایک کتبے میں بھی باجن کا نام سرے سے موجود نہیں ہے یا ان کے مسجد سے بلا واسطہ کسی قسم کے بھی تعلق کا کوئی اشارہ ملتا ہے۔ اس لئے مسجد کی تاریخ تعمیر یعنی ۷۷۸ھ مطابق ۱۴۰۲ء کو باجن کے ورودِ برہان پور سے کسی بھی طرح سے جوڑنا صحیح نہیں۔ [نمبر ۸]۔ مگر ڈاکٹر ڈیسائی نے اپنے مقدمے میں یہ ضرور تسلیم کیا ہے کہ "برہان پور کے بادشاہ کے عہد میں مسجد تعمیر ہوئی۔" جب یہ تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ شاہ باجنؒ کا مقبرہ احاطے میں شمال مشرق گوشے میں ایک خانقاہ سے متصل ہے۔ "اور پھر یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ "مسجد اور مقبرہ فاروقی دور کی تعمیری یادگار ہیں۔" تو پھر یہ تسلیم کرنے میں کیا قباحت ہے کہ یہ مسجد شاہ باجنؒ کے لئے بنائی گئی ہوگی۔ کتبوں میں شاہ باجن کا نام نہیں ہے اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب یہ وسیع احاطہ شاہ باجن کے لئے

بنوایا گیا تھا تو پھر اس وسیع احاطے میں تعمیر شدہ مسجد کسی دوسرے کے لئے بنوائی گئی ہو' یہ کیسے تسلیم کیا جائے گا۔ خانقاہ اور مسجد اس زمانے میں [پانچ سو سال پہلے] لازم وملزوم تھے تو پھر ہم ان کو الگ کر کے کیسے دیکھ سکتے ہیں؟

سنگِ سیاہ کی مسجد اور مقبرہ' فاروقی دور کی تعمیری یادگار ہیں۔ [کتاب بہاؤالدین ۹] اس جملے میں بھی تو جیسا ڈاکٹر ڈیسائی نے قبلہ مدنی مرحوم کے جملے [مزار کے متصل برہان کے بادشاہ ہمایوں اعظم عادل خان نے ایک شاندار مسجد تعمیر کی] کو لے کر استدلال کیا ہے [''مزار کے متصل مسجد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مزار کی تعمیر مسجد سے پہلے عمل میں آئی ڈیسائی]

اس کے مطابق ڈاکٹر شیخ فرید صاحب کے مذکورہ جملے میں مسجد کو مقبرے سے اولیت حاصل ہے پھر آپ کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ پہلے مسجد شاہ باجن کے لئے بنائی گئی اور ان کے وصال کے بعد ان کا مقبرہ بنایا گیا۔ پھر اگر یہ ترتیب [پہلے مسجد' پھر مقبرہ] صحیح ہے تو پھر یہ ماننا ہوگا کہ یہ مسجد شاہ باجن کے لئے بنائی گئی ہے اور کسی وجہ سے کتبے میں شاہ باجنؒ کا نام نہیں لکھا گیا ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود حضرت شاہ باجنؒ نے کتبے میں اپنا نام کندہ کروانا پسند نہ فرمایا ہو کیوں کہ اس زمانے میں روحانی بزرگ ایسے نام ونمود سے کوسوں دور رہتے تھے اس لئے مسجد کے کتبے میں آپ کا نام نہیں لکھا گیا۔ مسجد کس نے بنوائی؟ کتبہ کس نے لگوایا؟

کتبے میں شاہ باجنؒ کا نام کیوں نہیں؟ یہ کوئی اتنی اہم باتیں نہیں ہیں۔ جن کی وجہ سے حقیقت سے منہہ موڑا جائے۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مسجد اعظم ہمایوں نے بنوائی یا تاج بن کیلا نے اس کی تعمیر کروائی۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ مسجد اس زمانے میں بنائی گئی یا نہیں بنائی گئی؟

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شاہ باجنؒ جیسا صوفی عالم اور بزرگ وہاں قیام پذیر ہو اور مسجد کسی اور کے لئے بنوائی جائے اور پھر اس حقیقت یا بنیاد کو شاہ باجنؒ کے ورودِ برہان پور سے جوڑنا کیوں صحیح نہیں؟

کیا ڈاکٹر ضیاالدین ڈیسائی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شاہ باجنؒ یہاں قیام پذیر نہیں ہوئے اور نہ ہی مسجد ان کے لئے بنوائی گئی آپ کا مزار شریف اور مقبرہ ضرور ہے۔

یہ بات تو ایسی ہوئی جیسے کوئی کہے کہ شاہ جہاں کوئی بادشاہ نہیں تھا۔ نہ ہی ممتاز محل اس کی محبوب بیگم تھی۔ ہاں، تاج محل ضرور شاہ جہاں نے بنوایا ہے۔

جب یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ شاہ باجنؒ کے احاطے میں بنی ہوئی مسجد شاہ باجنؒ کے لئے ہی بنائی گئی ہے اور ۸۷۷ھ میں بنائی گئی ہے تو قبلہ مدنی صاحب مرحوم کی یہ بات تسلیم کرنی ہو گی کہ شاہ باجنؒ کی عمرِ عزیز کے چالیس سال برہان پور میں گزرے۔

شاہ باجنؒ کے نویں صدی کی آٹھویں دہائی میں برہان پور میں مستقل سکونت پزیر ہونے کے سلسلے میں ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ حضرت شیخ علی متقی نے اوّل شاہ باجنؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سات آٹھ سال کی عمر میں بیعت کی تھی۔ [تاریخِ برہان پور نمبر بحوالہ اخبار الاخیار عبدالحق اور سبحۃ المرجان میر غلام علی آزاد]

یہی بات ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے بھی لکھی ہے۔ [نمبر ۸]

''اوّلا پدر والا قدر او در عمر ہفت سالگی بخدمت شاہ باجنؒ کہ در برہان پور سکونت داشت مرید کرد۔'' [صفحہ ۳۰۳]

''برہان پور میں شیخ حسام الدین [متوفی ۹۶۰ھ نے علی متقی کو ان کا مرید کروایا۔ ''کتاب شاہ بہاؤ الدین باجنؒ'' نمبر ۸ بحوالہ خزینۃ الاصفیا نمبر ۴۲۳]

مرحوم ایڈوکیٹ نے ڈاکٹر شیخ فرید سے پہلے اپنی کتاب ''تاریخِ اولیائے کرام برہان پور'' میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ علی متقی کے والدِ ماجد اور برادرِ بزرگ حضرت شاہ باجنؒ کے مرید تھے۔

چنانچہ جب شیخ علی متقی کی عمر سات آٹھ سال کی تھی تو ان دونوں بزرگوں نے آپ کو حضرت شاہ باجن قدس سرہ کی خدمت میں پیش کیا اور ان کا مرید کروایا۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے اس سے متعلق اپنی ایک تصنیف میں خود تحریر کیا ہے کہ جب یہ فقیر بچہ تھا اس وقت والدِ بزرگوار نے شیخِ اجل شاہ باجن قدس سرہ کا مرید کر دیا تھا۔ ان کا طریقہ وجد و سماع صفا و ہیجان تھا۔ بس جب میں سنِ تمیز کو پہنچا اور حق و باطل کی خبر ہوئی ان کو ہی میں نے اپنا شیخ رکھا اور انہیں کے قول پر عمل کرنے کو راضی

ہوا۔ کیوں کہ مشائخ کا قول ہے کہ لڑکا جب مرید کر دیا جائے تو اس کو بالغ ہونے پر اختیار ہے کہ اس شیخ کو اپنا شیخ رکھے یا کوئی اور شیخ بنالے۔ میں نے انہیں کو اپنا شیخ رکھا جب میرے والد اور حضرت شیخ کا انتقال ہو گیا تو مشائخ خاندانِ عالیہ چشتیہ کا خرقہ حضرت شیخ عبدالحکیم بن شیخ باجنؒ سے حاصل کیا۔

"تاریخ برہان پور کے مؤلف مولوی خلیل الرحمان مرحوم نے شیخ علی متقی کی لکھی ہوئی وہ عربی عبارت بھی نقل کی ہے جو "تاریخِ برہان پور" کے صفحہ ۱۵۳ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اب آپ اس پر غور فرمایئے کہ آپ کے لکھے مطابق آپ کے والد نے ۸۹۲ھ میں آپ کو حضرت باجنؒ کا مرید کروایا تھا۔ کیوں کہ آپ کی پیدائش برہان پور میں ۸۸۵ھ میں ہوئی تھی۔

کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت باجنؒ کئی سال پہلے وہاں مقیم تھے؟ جبھی تو پہلے ان کے والد اور بعد میں آپ کے برادرِ بزرگ شاہ باجنؒ کے مرید ہوئے تھے۔ اور انھوں نے شیخ علی متقی کو شاہ باجنؒ کا مرید کروایا تھا۔

اب رہ جاتی ہے یہ بات کہ حضرت شاہ باجنؒ کس بادشاہ کے عہدِ حکومت میں برہان پور تشریف لائے؟ تو اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ اوپر دلائل سے یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ شاہ باجنؒ سن ۸۷۲ھ میں برہان پور تشریف لائے تھے اس زمانے میں برہان پور میں فاروقیہ سلطنت کے چوتھے بادشاہ میراں عینا المخاطب عادل خان بن مبارک خان کی حکومت تھی جو برہان پور کو از سرِ نو تعمیر کرنے فاروقی سلطان کا پڑپوتا تھا۔

میراں عینا عادل خان، فاروقی بادشاہوں میں سب سے زیادہ اعلیٰ حوصلہ بہادر اور نامور تھا۔ ہجری ۸۶۱ میں تخت پر بیٹھنے کے بعد اس بادشاہ نے برہان پور کو تھانیسر کے بجائے خاندیش کی راجدھانی بنانے کا نہ صرف یہ کہ فیصلہ کیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی کیا تھا۔

اسی نے برہان پور میں تاپتی کے کنارے شاہی قلعہ [قلعہ ارک] اور دیگر شاہی عمارتیں بنوائیں۔ حضرت شاہ نظام الدینؒ عرف حضرت شاہ بھکاریؒ کے والد بزرگوار حضرت شیخ یوسف جوسیؒ اسیر گڑھ کا مرید تھا۔

چھیالیس سال آٹھ ماہ حکومت کرنے کے بعد اس بادشاہ کی وفات ۹۰۷ھ میں ہوئی۔ یہ اپنی وصیت

کے مطابق برہان پور کے شاہی قبرستان [میدان دولت میدان] میں محو خواب ہے۔[بحوالہ تاریخ برہان پور نمبر خطیرۂ فاروقیہ]

تاریخِ برہان میں اس کا سن وفات ۸۹۷ھ لکھا ہے' جو صحیح نہیں ہے۔ اعظم ہمایوں ۹۱۴ھ فاروقیہ سلطنت کے تخت پر رونق افروز ہوا۔

خزانۂ رحمت

برہان پور کے جن روحانی بزرگوں نے شیخ سعدی دکنی برہان پوری کے بعد نویں اور دسویں صدی میں اردو ادب کی تشکیل کی ان میں درج ذیل تین بزرگان دین خاص طور پر مشہور اور قابل ذکر ہیں۔

[۱] حضرت شاہ بہاؤالدین باجن

[۲] شاہ نظام الدین عرف شاہ بھکاری

[۳] شاہ عبدالحکیم ابنِ شاہ باجن

ان میں حضرت شاہ باجن ہی ایسے پہلے روحانی بزرگ ہیں جن کی گراں قدر اور مشہور تصنیف ''خزانۂ رحمت'' کو برہان پور میں پہلی تصنیف ہونے کا درجہ حاصل ہے۔اس لحاظ سے آپ کو برہان پور کا پہلا صاحبِ تصنیف روحانی بزرگ کہا جا سکتا ہے۔اس سے پہلے برہان پور میں ادبی تشکیل کی باقاعدہ صورت نہیں ملتی۔اسی لئے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ''خزانۂ رحمت'' ہی برہان پور کی باقاعدہ پہلی تصنیف ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کی تصنیف سے بہت پہلے [قریب دو سو سال] ریختہ کے موجد اور اوّلین شاعر حضرت سعدی دکنی کی گنگا جمنی شاعری یہاں گونج رہی تھی۔اور ان کے ہندی اور فارسی کے فقروں کو ملا کر کہے گئے شعر آج بھی ہمارے ادب کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ان ہی کی شاعری سے ہمارے ملک میں اردو شاعری کی داغ بیل پڑی ہے۔اور برہان پور میں ادب کی تشکیل ہوئی ہے۔ مگر یہ صرف چند [تعداد نو] شعر کی صورت میں ہیں۔اس لئے ہم انھیں تصنیف [یا کتاب] نہیں کہہ سکتے۔کیوں کہ یہ کتاب کی تعریف میں نہیں آتے۔

اس لحاظ سے برہان پور کی پہلی تصنیف [یا کتاب] حضرت شاہ باجن کی ''خزانۂ رحمت'' ہی قرار پاتی ہے جو آج دنیا میں موجود اور محفوظ ہے۔اور اس کے دو نسخوں کی نشان دہی کتاب ''سخنوران گجرات'' کے مصنف ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم [متوفی ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء جمعہ سورت] نے کی ہے۔اور برہان پور کے ریسرچ اسکالر ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے اپنی تصنیف ''شاہ بہاؤالدین باجن'' [سنِ اشاعت ۱۹۹۲ء] میں یہ کہا ہے کہ اس کے پانچ نسخے ہیں۔

ان کے لکھے مطابق حضرت شاہ باجن نے احمد آباد سے آکر برہان پور میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد اس کتاب کو لکھنا شروع کیا۔

یہ بات تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ شاہ باجن ۸۷۲ھ کے لگ بھگ برہان پور تشریف لائے تھے۔[تفصیل کے لئے راقم کا مضمون ''برہان پور میں حضرت شاہ باجن کی آمد۔۔۔ایک سوال'' ملاحظہ کیجئے]

اس لئے ہم یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب برہان پور میں نویں صدی کی آٹھویں دہائی میں لکھی گئی ہے اس سے پہلے کبھی اس کتاب کے لکھے جانے کی تحقیق ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ہاں' برہان پور میں اردو شاعری کی ابتدا حضرت سعدی دکنی برہان پوری کے کلام سے ہوئی ہے۔حضرت باجن اس لحاظ سے برہان پور کے دوسرے شاعر ہیں۔جن کا ہندی اور گجری کلام یہاں گونجا بھی ہے اور ترتیب بھی پایا ہے۔اور جو ہمارے سامنے کتابی شکل میں موجود ہے۔یہ ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے۔

برہان پور کی یہ مایہ ناز تصنیف فارسی زبان میں تصنیف کی گئی ہے۔اس بارے میں تاریخ برہان پور کے مئولف جناب مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم [متوفی حیدر آباد] ابنِ قاضی غلام محمد مرحوم [متنغی ۱۲۶۵ھ عادل آباد] کا یہ کہنا ہے کہ تصنیفات سے جناب موصوف [شاہ بہاؤ الدین باجن] کی کتاب ''خزانۂ رحمت اللہ'' جو ملفوظات و ارشادات سے آپ کے پیر و مرشد کامل کے ہیں اور مضامینِ سلوک و طریقت سے بزبانِ فارسی ہے' بہت عمدہ کتاب ہے۔کمترین بھی اس کے مطالعے سے مشرف ہوا ہے۔اس زمانے میں جو ملکِ ہند کی زبان تھی۔اس کلماتِ شعر بمضمون تصوف کبھی کبھی موزوں فرماتے تھے بحوائے:

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ اید در حدیث دیگراں

ازاں بعد جملہ یہ ہے کہ:

یوں باجن باجے رے
اسرار چھاجے
مبندل من میں دھمکے
رباب رنگ میں چھکے
صوفی اُن پر تھمکے [نمبر ۱۳۳]

عبدالقادر صاحب جاوید انصاری مرحوم [متوفی ۵ مارچ ۱۹۹۳ء جمعہ] اپنی تالیف "سلکِ گوہر [سن اشاعت ۱۹۴۸ء] میں لکھا ہے کہ آپ کی تصنیف سے "خزانۂ رحمت یادگار" ہے۔ جسمیں اپنے مرشد [حضرت مخدوم رحمت اللہ] کے ارشادات اور ملفوظات تحریر کیے ہیں۔ [نمبر ۹]
اور اپنے دوسرے کتابچے "یادگارِ سلف" [سند تالیف ۱۹۸۳ء مالیگاؤں] میں لکھتے ہیں کہ تصوف اور علم سلوک میں ایک ضخیم کتاب "خزانۂ رحمت" لکھی جو فارسی میں ہے۔ اس میں ہندی دوہے اور اشعار ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مولانا سید احکام اللہ صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے چند نسخے دیگر لائبریریوں میں ہیں۔ [۵۰۶]
سید ظہیر الدین مدنی مرحوم نے اپنی تصنیف "سخنورانِ گجرات" میں تحریر فرمایا ہے کہ شاہ باجن نے اپنی ایک تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ اس کا ایک نسخہ اورینٹل کالج لاہور میں محفوظ ہے۔ اس کے معنی و مطالب پر حافظ محمود شیرانی نے اورینٹل کالج کے نومبر ۱۹۳۰ء کے شمارے میں مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ ان کے لکھے مطابق "خزانۂ رحمت" کا دوسرا نسخہ جامع مسجد کے خطیب حضرت احکام اللہ صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں قبلہ مدنی صاحب مرحوم نے جو تفصیل لکھی ہے وہ میں قارئین کی دل چسپی کی خاطر پیش کر رہا ہوں تاکہ اس کی مزید تحقیق میں آسانی ہو۔
"سید مطیع اللہ راشد برہان پوری مرحوم سے ۱۹۴۲ء میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ مذکورہ تصنیف کا ایک نسخہ برہان پور میں مشائخ خاندان کے ایک شخص محمد رفیع الدین کے کتب خانہ میں محفوظ

ہے۔ میں نے راشد صاحب کے توسط سے ہر چند حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہو سکی جب راشد صاحب کو نسخہ دستیاب ہوا تو انھوں نے اس میں ۔ ے باجن کا ہندی کلام نقل کر کے پروفیسر ندوی صاحب کے پتے پر بھیجا۔ جس کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ ۱۹۷۱ء میں ندوی صاحب کے قلمی ذخیرے میں یہ پایا گیا۔ مولوی رفیع الدین کا نسخہ ان کی وفات کے بعد برہان پور کی جمع مسجد کے خطیب احکام اللہ صاحب کے کتب خانے میں محفوظ کر دیا گیا۔ جسے اب احکام اللہ صاحب کے بھتیجے اور خطیب جامع مسجد حضرت حکیم توحید میاں صاحب کی کشادہ دلی اور علم دوستی کی وجہ سے دیکھنے کو ملا ہے۔ اسی نسخے کے پیشِ نظر ڈاکٹر فرید شیخ نے ایک مضمون قلم بند کیا ہے جو "نوائے ادب" بمبئی کے شمارہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں شائع کیا گیا ہے۔ آگے چل کر قبلہ مرحوم مدنی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ "خزانۂ رحمت" زبان اور موضوع دونوں حیثیتوں سے اہمیت کا مالک ہے۔" [نمبر ۵۰۔۴۹]

برہان پور کے دیگر دو صاحبِ تصنیف عالم حضرت مولوی معین الدین صاحب ندوی مرحوم [متوفی برہان پور] اور جناب بشیر محمد خاں صاحب ایڈوکیٹ مرحوم [متوفی برہان پور] نے "خزانۂ رحمت" پر اپنی تصنیف میں تفصیل سے لکھا ہے۔ برہان پور میں فارسی نثر میں لکھی گئی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے مولوی صاحب نے خاص طور سے "خزانۂ رحمت" کا حوالہ دیا ہے۔ بشیر محمد خان صاحب ایڈوکیٹ مرحوم نے اپنی تصنیف "اولیائے کرام برہان پور" [سنِ اشاعت ۱۹۹۲ء] میں لکھا ہے "آپ صاحبِ تصنیف بھی تھے۔" آپ نے ایک کتاب فارسی میں تقریباً چھ سو صفحہ کی لکھی ہے آپ کے پیر و مرشد حضرت مخدوم رحمت اللہ ابن شیخ عزیز اللہ متوکل مانڈوی تھے۔ آپ جو کلمات اپنے پیر کی زبان سے اور مشائخ سلف کی مناقب سے سب جمع کر لیتے اور اس طرح ایک کتاب تصنیف کی۔ اور اپنے پیر کے نام سے "خزانۂ رحمت" موسوم کیا۔ یہ کتاب علمِ سلوک اور حقائق میں ہے۔ توحید و معارف کا سفینہ اور اسرار و رموز کا آئینہ ہے۔ جس میں آپ کے فارسی اشعار اور ہندی دوہے بھی شامل ہیں اس کے علاوہ بحیثیت ایک صوفی شاعر کے ایک دیوان بھی لکھا ہے۔ جو ریختہ اردو میں ہے۔

"خزانۂ رحمت" فارسی نثر میں ایک اہم کتاب ہے۔ اس سے مذکورہ عالموں کو اختلاف نہیں۔ لیکن اس کا صحیح نام کیا ہے؟ خزائن رحمت یا خزانۂ رحمت ۔۔۔ یہ سوال قابلِ غور ہے۔ کیوں کہ کسی نے

اسے ''خزانۂ رحمت'' کہا ہے اور کسی نے اسے ''خزانۂ رحمت'' سے موسوم کیا ہے۔ کئی عالموں نے 'جن میں مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم قابلِ ذکر ہیں' اسے خزانۂ رحمت لکھا ہے۔ اور جن عالموں نے اسے خزائن رحمت لکھا ہے ان میں ڈاکٹر شیخ فرید صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے اسے خزائنِ رحمت اللہ لکھا ہے۔ اس کے اجمالی خاکے میں ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ شاہ باجن نے ملفوظ کا نام خزائنِ رحمت اللہ لکھا ہے مگر عام طور پر خزانۂ عالم کے نام سے مشہور ہے مگر اسی صفحہ پر جو عنوان جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے وہ ہے ''خزانۂ رحمت''۔ آپ کی کتاب شاہ بہاؤالدین میں جگہ جگہ جو حوالہ جات ہیں ان میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے زیادہ تر خزائنِ رحمت ہی لکھا ہے۔ مگر کہیں کہیں مضمون میں خزانۂ رحمت بھی نظر آتا ہے۔ جیسے ''پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے کتب خانہ میں کئی نوادرات تھے۔ مگر خزانۂ رحمت اللہ کا نسخہ نہ تھا۔''[۲۱]

پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے دل سے کتاب کا نام ''خزائنِ رحمت'' ہی تسلیم ہے۔ یہ بات اس وجہ تسمیہ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ شاہ باجن نے اس تصنیف کا نام اپنے پیرو مرشد کے نام کی رعایت سے رکھا ہے۔ لیکن ان کے ذہن میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت[۹۹] بھی ہو گی:

قل تو انتم مٰلکون خزائن رحمتِۃ ربّی إذاۃَ خشیۃ إلاہ نفاق ط

اپنی کتاب سخنورانِ گجرات میں قبلہ مدنی صاحب مرحوم میں اسے خزانۂ رحمت لکھا ہے۔ ان کے لکھے مطابق خود شاہ باجن نے اسے خزانۂ رحمت ہی کا نام دیا ہے۔

ایں رسالہ **خزانۂ رحمت اللہ** نام نہاد

مگر ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے اپنی کتاب شاہ بہاؤالدین باجن میں عنوان سبب تالیف کے تحت جو خزائن رحمت کی عبارت نقل کی ہے وہ یہ ہے:

ایں فقیر بہاؤالدین المقلب بہ باجن کہ غلام المشائخ المفتقر الی اللہ رحمت اللہ قدس سرہ العزیز است۔ بعض کلمات مشائخ سلف و مناقب الیشاں

که منقول از تشت معتبر جمع کرده بود آن چه طبع ایں فقیر گنجد و سنجید
تحریر یافت و ایں رسالہ را خزانہ رحمت اللہ نام نہاد [۶۳]

سمجھ میں نہیں آتا کس عبارت کو صحیح تسلیم کیا جائے اور کسے غلط؟ کیوں کہ مذکورہ عبارت کو لکھنے والے دونوں ہی محقق قابل اور لائق ہیں۔ جن کی قابلیت میں رتّی برابر بھی شک نہیں اور دونوں ہی صاحبان کے پیش نظر شاہ باجن کی خزانۂ رحمت یا [خزائن رحمت] کا نسخہ رہا ہوگا۔ جس کا یقین ہے تو پھر یہ اختلاف کیوں؟

جواب میں ایک خیال یہ ہے کہ قبلہ مدنی صاحب کے پیش نظر اس وقت جو نسخہ [یا اس کی نقل] رہا ہوگا اس میں مذکورہ عبارت میں خزانۂ رحمت لکھا ہوگا۔ جیسا کہ موصوف نے لکھا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر شیخ فرید صاحب کے پاس جو نسخہ ہوگا اس میں مذکورہ عبارت میں خزائن رحمت لکھا ہوگا۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے۔

مگر جہاں تک میرا خیال ہے قبلہ مدنی صاحب مرحوم نے مذکورہ عبارت اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھی ہے۔ کیوں کہ ان کے مطابق ان کے پاس خزانۂ رحمت کا کوئی نسخہ نہ تھا۔ موصوف نے خود لکھا ہے کہ:

> مولوی رفیع الدین کا نسخہ ان کی وفات کے بعد برہان پور کی مسجد جامع مسجد کے خطیب مرحوم حضرت احکام اللہ کے کتب خانہ میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ جو اب احکام اللہ حضرت کے بھتیجے اور خطیب جامع مسجد حضرت توحید صاحب کی کشادہ دلی اور علم دوستی کی وجہ سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خزانۂ رحمت کا نسخہ قبلہ مدنی صاحب مرحوم نے صرف دیکھا تھا۔ انھیں اس کا نسخہ ملا نہیں تھا۔ اور آپ کو جو نقل مرحوم مطیع اللہ صاحب راشد برہان پوری نے پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے پتے سے بھیجی تھی وہ صرف شاہ باجن کے ہندی کے کلام کی تھی۔ پورے نسخے کی نہیں تھی۔ تفصیل کے لئے ''سخنوران گجرات'' دیکھی جا سکتی ہے۔

ایک سوال اور غور طلب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خزانۂ رحمت یا خزائن رحمت کتنے صفحات پر مشتمل

ہونا تحریر کیا ہے۔بشیر محمد خاں صاحب ایڈوکیٹ مرحوم نے اسے چھ سو صفحات پر مشتمل ہونا لکھا ہے جب کہ مولوی معین الدین صاحب ندوی مرحوم نے تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہونا بتایا ہے۔ اور ڈاکٹر شیخ فرید کی کتاب شاہ بہاؤالدین باجن کے مقدمہ نگار ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کا یہ کہنا ہے کہ نسخہ کراچی تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔[نمبر ۵]اور خود ڈاکٹر شیخ فرید نے نو سو صفحات پر مشتمل ہونا بتایا ہے۔اس لئے خیال ہوتا ہے کہ آخر یہ ہے کتنے صفحات پر مشتمل؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ خزانۂ رحمت کے الگ الگ نسخے ہیں۔اور ہو سکتا ہے کہ اس کے صفحات کی تعداد بھی الگ الگ ہو۔بشیر محمد خاں صاحب ایڈوکیٹ مرحوم کے پیش نظر جو نسخہ ہو گا اس کے صفحات کی تعداد چھ سو ہو گی۔اس لئے انھوں نے اپنی کتاب ''تاریخ اولیائے برہان پور'' میں اس کی تعداد چھ سو لکھ دی۔اسی طرح دوسرے عالموں نے بھی اپنی اپنی معلومات کے مطابق تعداد لکھی ہے۔ایسا کہا جا سکتا ہے۔لیکن ڈاکٹر شیخ فرید صاحب ان چاروں نسخوں کے بارے میں لکھ سکتے تھے جن کی تفصیل موصوف نے اپنی کتاب میں دی ہے۔وہ چاہتے تو یہ بھی لکھ سکتے تھے۔کم از کم وہ یہی لکھ دیتے کہ انھوں نے نو سو صفحات پر مشتمل ہونا لکھا ہے وہ کس نسخے کے پیش نظر لکھا ہے۔؟ تو بہتر ہوتا۔

یہاں میں یہ بتانا مناسب اور ضروری خیال کرتا ہوں کہ ابھی تک جو تحقیق ہوئی ہے اس کے مطابق خزانۂ رحمت کے کُل پانچ نسخوں کا پتہ چلا ہے وہ بھی ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ان کے کاتب الگ الگ ہیں ۔ان میں سے تین نسخے محترمی ڈاکٹر شیخ فرید کے لکھے مطابق برہان پور میں ہیں۔

ان میں سے ایک تو برہان پور کی جامع مسجد کے پیش امام کے پاس ہے اور دوسرا سیّد مطیع اللہ راشدؔ برہانپوری کے پاس اور تیسرا بشیر محمد خاں صاحب ایڈوکیٹ مرحوم کے پاس ہونا ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھا ہے۔جو ان کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خزانۂ رحمت کا ایک نسخہ [جسے نسخہ برہان پور لکھا گیا ہے]وہ ڈاکٹر ظہیر

الدین مرحوم اور ڈاکٹر فرید صاحب کے کہے مطابق برہان پور کی شاہی مسجد کے موجودہ پیش امام و خطیب جناب مولوی سیّد اکرام اللہ صاحب ابنِ حکیم شمس التوحید صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ نسخہ کون سا ہے؟ آیا یہ نسخہ مذکورہ کتب خانے میں ۱۹۴۲ء سے پہلے موجود ہے۔ یا پھر یہ وہ نسخہ ہے جو بقول ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صاحب مرحوم مولوی رفیع الدین صاحب مرحوم [ابن مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم] والا نسخہ ہے۔ جو مولوی صاحب کی وفات کے بعد مذکورہ کتب خانہ میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ یہ بات مولوی صاحب مرحوم کو برہان پور کے مایہ ناز عالم سیّد مطیع اللہ راشدؔ برہان پوری متوفی ۱۹۶۰ء، نے ۱۹۴۲ء میں بتائی تھی کہ خزانۂ رحمت کا ایک نسخہ محمد رفیع الدین صاحب کے پاس ہے۔ مدنی صاحب مرحوم نے اسے حاصل کرنے کی ہر چند کوشش کی لیکن انھیں کامیابی نہیں ملی۔ بعد میں انھیں معلوم ہوا کہ یہ نسخہ مولوی صاحب موصوف کی وفات کے بعد مذکورہ کتب خانہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ مذکورہ دونوں عالموں کی باتوں سے پہلا خیال یہ بنتا ہے کہ برہان پور کی شاہی مسجد کے پیش امام صاحب کے کتب خانہ میں پہلے سے خزانۂ رحمت کا ایک نسخہ تھا اور دوسرا نسخہ مولوی محمد رفیع الدین مرحوم والا ان کی وفات کے بعد مذکورہ کتب خانے کو دے دیا گیا۔ اس طرح مذکورہ کتب خانے میں دو نسخے ہو گئے۔ لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلّق ہے مذکورہ کتب خانے میں صرف ایک نسخہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خزانۂ رحمت کا یہ نسخہ مولوی رفیع الدین صاحب والا نسخہ ہو۔ جسے قبلہ مدنی صاحب کو ڈاکٹر سیّد شمس التوحید صاحب مرحوم ابن مرحوم کی کشادہ دلی سے دیکھنے کو ملا تھا۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیّد مطیع اللہ راشدؔ برہان پوری کے پاس خزانۂ رحمت کا کون سا نسخہ تھا؟ جس کے بارے میں ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے یہ لکھا ہے کہ نصف آخر یا مکمل املا کے پیش نظر قدیم نسخہ ہے [۱۵]۔

راشدؔ صاحب مرحوم جب ہجرت کر کے کراچی چلے گئے۔ تو وہ اپنی ساری قیمتی اور نادر الوجود کتابیں اپنے ساتھ پہلے حیدر آباد [دکن] اور پھر وہاں سے کراچی لے گئے تھے۔ یہ بات مرحوم کے عزیز اور معتبر شاگردوں سے مجھے معلوم ہوئی ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے مگر راشدؔ صاحب نے اپنی

تصنیف "برہان پور کے سندھی اولیاء" اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے اپنی اسی تصنیف میں ان دیگر تصنیفوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ان کے پاس محفوظ ہیں۔ لیکن انھوں نے "خزانۂ رحمت" کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ اس لئے اس بات کی صداقت میں شک پیدا ہوتا ہے کہ ان کے پاس "خزانۂ رحمت" کا کوئی نسخہ تھا۔ اگر ان کے پاس اس کا کوئی نسخہ ہوتا تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اس بات کو پوشیدہ رکھنے میں کوئی مصلحت بظاہر نظر نہیں آتی۔ اس لئے راشدؔ صاحب کے پاس نسخہ ہونے کا یقین نہیں آتا۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ہمارے معزز محقق ڈاکٹر شیخ فرید صاحب کیوں جھوٹ لکھنے لگے؟ کہ راشدؔ صاحب والا نسخہ املا کی خصوصیات کے پیش نظر قدیم نسخہ ہے؟

کیا اس میں سچائی نہیں ہے؟ اگر سچائی ہے تو پھر اس کے وجود کا ثبوت کیا ہے؟ کیوں کہ محترمی شیخ فرید صاحب نے اس کے قدیم ہونے کی بات تو لکھ دی لیکن اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔

طریقے سے تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اس کی موجودگی کے بارے میں کوئی حوالہ یا ثبوت پیش کرتے۔ مگر افسوس ڈاکٹر موصوف نے اس سلسلے میں یہ نہیں لکھا کہ انھوں کب کہاں اور کس کے پاس دیکھا تھا؟ اگر نہیں دیکھا تھا صرف اس کے بارے میں سنا تھا تو موصوف کو یہ لکھنا چاہئے تھا کہ اس کے بارے میں فلاں شخص سے فلاں وقت سنا تھا۔ اگر خوش قامتی سے انھیں یہ نسخہ دستیاب ہو گیا ہے یا اس کی نقل مل گئی ہے تو پھر ویسا لکھنا چاہئے تھا۔ اس میں راز داری برتنے سے کیا مطلب ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر موصوف اس سلسلے میں کچھ بھی لکھنے کی زحمت گوارہ فرماتے تو اس پر آگے تحقیق کرنے والوں کو بڑی سہولت ہوتی۔ مگر بسا آرزو کہ خاک شد۔۔۔۔

نہ جانے کیوں ڈاکٹر صاحب نے اسے راز بنا کر اپنے سینے تک محدود رکھنا مناسب سمجھا۔ یہ بات تو وہی بہتر طور پر جانتے ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ایک محقق کو اتنا محتاط اور کم نظر بھی نہیں ہونا چاہئے۔ علم و ادب کی خاطر ایک محقق کو اپنی

محنت و کوشش کھلے دل سے ظاہر کرنی چاہئے۔ اور اس کے پاس جو کچھ تاریخی ذخیرہ ہے اس کو عوامی بنانا چاہئے۔ تاکہ دوسرے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اسی میں اس کا بڑاپن ہے اور اسی میں علم و ادب کی بھلائی ہے۔

اس نسخے کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے ایک نسخہ مملوکہ مولوی سیّد احکام اللہ صاحب مرحوم برہان پوری بتایا ہے۔ قبلہ مدنی صاحب مرحوم نے "سخنوران گجرات" میں لکھا ہے کہ برہان پور کے نسخے پر ڈاکٹر شیخ فرید کا مضمون نوائے ادب اکتوبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا اس نسخے کے بارے میں موصوف نے لکھا ہے کہ:

"ناقص الاخر ہے باب چہارم کے آخر تک ہے۔[نمبر ۱۵]"

اس نسخے کے بارے میں موصوف نے یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ نسخہ آیا مولوی محمد رفیع الدین صاحب مرحوم والا ہے یا کوئی دوسرا نسخہ ہے؟ یہ نسخہ موصوف نے دیکھا ضرور ہوگا جب ہی تو انھوں نے اس کے بارے میں مذکورہ تفصیلات لکھی ہیں۔ اور انھوں نے کتاب "سخنوران گجرات" میں قبلہ مدنی صاحب مرحوم کی وہ بات پڑھی ہوگی جو مدنی صاحب نے اس نسخے کے بارے میں لکھی ہے۔ جس کا یقین ہے تو پھر موصوف کو اس پر اظہار کرنا چاہئے تھا۔ کہ یہ نسخہ مولوی محمد رفیع الدین صاحب مرحوم والا نسخہ ہے یا نہیں ہے؟ مگر اس بارے میں موصوف نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ جو دکھ کی بات ہے۔

اس کے علاوہ موصوف نے ایک نسخہ مملوکہ بشیر محمد خان وکیل مرحوم برہان پوری لکھا ہے جس کی تفصیل موصوف نے یہ لکھی ہیکہ

"انتہائی بد خط نسخہ ہے۔ آخر میں ترقیمہ نہیں ہے۔ کرم خوردہ
اور آب زدہ ہے۔ درمیان سے اکثر اوراق غائب ہیں۔ اور ایک
دوسرے میں چپکے ہوئے ہیں۔ متن میں خامیاں ہیں۔"[۱۵]

مگر وکیل صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں اپنی کتاب "تاریخ اولیائے برہان پور" [سن اشاعت ۱۹۹۲] میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے کہ "خزانۂ رحمت" کا نسخہ ان کے پاس ہے یا نہیں ہے؟ بلکہ انھوں

نے یہ لکھا ہے کہ

"مولوی سیّد احکام اللہ صاحب [پیش امام شاہی جامع مسجد برہان پور نے کئی کتابیں مجھے دیں جن کی میں نے نقلیں کیں۔ خصوصاً حضرت شاہ باجن کی تصنیف "خزانۂ رحمت" جو نایاب ہے۔ ہندوستان میں ایک یا دو نسخے اور ہیں وہ بھی عنایت کی۔ اور اس سے میں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ [نمبر ۱۳]"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وکیل صاحب مرحوم کے پاس "خزانۂ رحمت" کا وہ نسخہ نہیں تھا جس کی تفصیل ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے لکھی ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔

میں نے بشیر محمد خان صاحب مرحوم کے بڑے صاحب زادے اقبال محمد خان صاحب فریدی مرحوم سے، جب کہ وہ بقید حیات تھے، بہت معلوم کرنے کی کوشش کی مگر وہ ٹھیک سے کوئی جواب نہ دے سکے۔ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ کاغذات دیکھنے پڑیں گے۔ ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ نسخہ ان کے پاس موجود ہے۔ یہ بات تحقیق طلب ہے۔ اس سلسلے میں میری کوششیں جاری ہیں۔ ایڈوکیٹ مرحوم کے دو فرزند جمیل احمد خان اور عقیل احمد خان خدا کے فضل سے ابھی بقید حیات ہیں۔ اور وہ رشتے میں میرے عزیز بھائی بھی ہیں۔ ان کی سگی بھانجی فرزانہ انیس میرے بچے انیس منشاء سے بیاہی ہیں۔

ان نسخوں کے علاوہ موصوف نے اور دو نسخوں کی تفصیل لکھی ہے۔ جو ان کے مطابق ایک لاہور میں اور ایک کراچی میں محفوظ ہے۔

لاہور والے اس نسخہ چہارم کو موصوف نے نسخہ شیرانی لکھا ہے۔ اس نسخے کے بارے میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ کہنا ہے کہ یہ نسخہ گلستان رحمت بارہویں صدی کے خاتمہ کا لکھا ہوا ہے۔ جو سخت غلط ہے اس کی املائی خصوصیات نویں صدی ہجری کے نوشتہ بحر الفضائل سے مماثل ہیں ۱۵ شاہ بہاؤالدین باجن بحوالہ مقالہ اردو املا کی تاریخ از ڈاکٹر مصطفی خان اور معارف جون ۵۱ء علمی نقوش نمبر ۱۰۸]۔ قبلہ مدنی صاحب مرحوم نے اسے اورینٹل کالج لاہور میں

محفوظ بتایا ہے۔ ان کے لکھے مطابق اس نسخے کے معنی و مطالب پر حافظ محمود شیرانی کا ایک مضمون اورینٹل کالج میگزن نومبر ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا[۴۹]۔ یہ نسخہ میرے خیال سے ماضی میں برہان پور میں کسی کے پاس تھا۔ جو نہ جانے کیسے حافظ محمود شیرانی صاحب کو حاصل ہو گیا۔ پھر ان کے پاس سے اور صاحب کے ذریعے لاہور کے اورینٹل کالج کی زینت بن گیا۔ اگر اس بارے میں کچھ تلاش و جستجو کی جائے تو میرے خیال سے بہت سی مفید اور دلچسپ باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ جو آگے تحقیق کرنے والوں کے بہت کام آئیں گی۔ کیوں کہ شاید یہی وہ نسخہ ہے جس کے پیش نظر حافظ محمود شیرانی صاحب نے باجن پر مقالات قلمبند کئے ہیں۔ ڈاکٹر شیخ فرید کے لکھے مطابق شیرانی صاحب موصوف ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے شاہ باجن پر سب سے زیادہ لکھا ہے[۱۵]

پانچوں نسخہ کراچی میں ہونے کی وجہ سے کراچی نسخہ کہلاتا ہے۔ اس کا زیروکس ڈاکٹر شیخ فرید صاحب کے پاس ہے۔ موصوف نے اس نسخے کو نسخہ پنجم انجمن ترقی اردو لکھا ہے۔ موصوف کے لکھے مطابق یہ نسخہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کو برہان پور میں ۱۹یا۲۱ء میں دستیاب ہوا تھا۔ میرے خیال سے یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ بابائے اردو کو یہ نسخہ برہان پور میں کس سے دستیاب ہوا تھا؟ اس سے بھی بہت سی مفید اور دلچسپ باتیں سامنے آنے کی امید ہے۔ یہ بات بھی کافی دلچسپ ہے کہ کیا بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کیا کبھی برہان پور تشریف لائے تھے؟ اور کہاں قیام فرمایا تھا؟ ان سوالات کے جوابات واقعی دلچسپ ثابت ہوں گے۔

مذکورہ بالا نسخے کے سلسلے میں محترمی شیخ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے بہت سی مفید اور کار آمد معلومات فراہم کی ہیں۔ جو تحقیق کرنے والوں کے بہت کام آسکتی ہیں۔ ناظرین کرام کی دلچسپی کی خاطر میں چند باتیں یہاں درج کر رہا ہوں۔

یہ ۱۲۵۶ھ کا نقل شدہ ہے۔ ترقیمہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے شاہ باجن کے خاندان کے ایک فرد قدرت اللہ بن اسد اللہ نے نقل کیا ہے۔ اس نسخے کی املائی کیفیت نویں صدی کے نصف اول کی ہیں۔ مثلاً [illegible] مرکز نہیں ہے۔ ت۔ ڈ۔ ڑ۔ کے نشان ط کے لئے چار نقطے :: اور مشد : کو دو بار لکھا گیا ہے۔

[۲] گمان غالب ہے کہ خزائنِ رحمت کا قدیم خاندان میں محفوظ ہوگا۔ پہلی یا دوسری نقل اشاعت ہوئی ہوگی۔ اس کو محفوظ کرنے کے لئے قدرت اللہ۔ نے زیر نظر نسخہ نقل کیا ہے اسد اللہ [متوفی ۱۲۰۵ھ] کی وفات کے ۶۰ سال بعد یہ نسخہ نقل کیا گیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس نسخے سے یہ نقل کیا گیا وہ کس سن کا مکتوبہ ہے؟

[۳] برہان پور کے نسخہ اوّل کے متن میں اور اس کے متن میں معمولی سا فرق ہے۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ حضرت شاہ باجن کے حالات زندگی اور ان کے کلام پر ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے کتاب لکھ کر قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کیوں کہ بقول ڈاکٹر ضیاء الدین یہ اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ بھی ہے۔ اور علمی حلقوں میں تحسین کی نظر سے دیکھے جانے کے لائق بھی۔ لیکن صاحب موصوف کی اس بات سے قطعی طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر فرید نے "خزانۂ رحمت" کے نسخوں کا سراغ لگایا ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہی نہیں بلکہ حقیقت پر پردہ ڈالنے والی ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ڈاکٹر فرید صاحب سے بہت پہلے ہمارے معزز محققین حضرات نے نہ صرف یہ کہ "خزانہ رحمت" کا سراغ لگالیا۔ بلکہ اسے حاصل کر کے بغور مطالعہ بھی کیا ہے۔ اور اس پر مقالات بھی سپرد قلم کئے ہیں۔ یہ مقالات ادبی رسالوں اور کتابوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ جس سے ایک دنیا واقف ہے۔ بطور ثبوت کے اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے بہت پہلے ۱۹۴۲ء میں برہان پور کے ایک جیّد عالم علامی سیّد مطیع اللہ راشدؔ صاحب مرحوم برہان پوری کتاب "سخنوران گجرات" کے مصنف ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین صاحب مدنی مرحوم کو "خزانۂ رحمت" کے ایک نسخے کے سلسلے میں بتا چکے ہیں کہ یہ نسخہ برہان پور کے مشائخ خاندان کے ایک فرد جناب مولوی رفیع الدین کے پاس ہے۔ اور انھوں نے "خزانۂ رحمت" کا نسخہ دریافت کر کے شاہ باجن کا ہندی کا کلام نقل کر کے بھیج بھی دیا ہے۔ اور اس سے بھی بہت پہلے ۱۹۳۰ء میں "خزانۂ رحمت" کے معنی و مطالب پر حافظ محمود شیرانی صاحب مرحوم کا ایک مضمون اورینٹل کالج میگزین [نومبر ۱۹۳۰ء] میں شائع ہو چکا تھا۔ اور اس

سے بھی بہت پہلے ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۱ء میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کو "خزانۂ رحمت" کا ایک نسخہ دستیاب ہو چکا تھا۔ اور موصوف اس پر مقالات بھی لکھ چکے تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ کسی ایک محقق نے ان نسخوں کا سراغ لگایا ہے قطعی غلط ہے۔ اس سے کسی کو خوش تو کیا جاسکتا ہے مگر اردو داں حضرات کو زیادہ دیر تک مغالطے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ بات تو ویسی ہوئی کہ کسی کا حق مار کر کسی کو انعام دیا جائے۔ محنت کسی اور نے کی اور جھنڈے پر کسی اور کو چڑھا دیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر ضیاءالدین ڈیسائی کی یہ بات کاغذ کے پھولوں جیسی لگتی ہے جس سے خوشبو کی امید رکھنا سراسر غلط ہوگا۔ ان کی ان باتوں کو غلط ثابت کرنے کے لئے خود ڈاکٹر شیخ فرید کی کتاب شاہ بہاؤالدین باجن [سن اشاعت ۱۹۹۲ء] سے بے شمار حوالے دیئے جاسکتے ہیں۔

کہاں رہا ۱۹۳۰ء اور کہاں رہا ۱۹۹۲ء؟ ان ۶۲ برسوں میں تاپتی ندی میں کتنا پانی بہہ چکا ہے؟ یہ ڈاکٹر ڈیسائی کیا جانتے ہیں پھر کہنے سے کیا فائدہ؟ حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ کی درگاہ برہان پور میں زیارت گاہِ خاص و عام بنی ہوئی ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب موصوف کیا نہیں جانتے، پھر کہنے سے کیا فائدہ؟

اس سلسلے میں آخر میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اور وہ ہے کہ ڈاکٹر شیخ فرید کے پاس کراچی نسخے کا جو زیروکس ہے وہ شاید کلیم اللہ انصاری [حال مقیم کراچی] برہان پوری کا بھجوایا ہوا ہے۔

کلیم اللہ انصاری ایک مایہ ناز استاد شاعر حضرت خیالؔی برہان پوری مرحوم کے بڑے فرزند اور حضرت محمد حشمت اللہ صاحب ریاضؔ برہان پوری مرحوم کے بھتیجے ہیں۔

یہ خیال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ کلیم اللہ انصاری نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو شاہ بہاؤالدین باجن کی مثنوی کے بارے میں لکھا تھا جو نیشنل میوزم کراچی میں محفوظ ہے۔

سولہ سو صفحات کی یہ مثنوی جس کا نام جنگ نامہ پشواز و ساڑی و چولی و تہبند ازار و پیرہن ہے کتاب شاہ بہاؤالدین باجن کے آخر میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خزانۂ رحمت کے بارے میں

"ہماری زبان" دہلی کی ۸ اور ۱۶ جنوری ۹۶ء کی اشاعتوں میں جب میرا مضمون "خزانۂ رحمت" شائع ہوا تو میرے بہت سے کرم فرماؤں نے کتاب خزانۂ رحمت" کے مصنف اور برہان پور کے روحانی بزرگ حضرت شاہ برہان الدین باجن قدس سرہ' کے حالاتِ زندگی کے بارے میں مجھ سے بہت سے سوالات کئے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ موصوف کے واقعاتِ زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں میں نے انہی سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔
اس سے پہلے کہ برہان پور دار السرور کی اوّلین تصنیف "خزانۂ رحمت" کے مصنف قدوۃ السالکین حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کے حالاتِ زندگی بیان کئے جائیں اور ان کی زندگی کے اہم واقعات سے متعلق جو سوالات میرے کرم فرماؤں نے مجھ سے کئے ہیں 'ان پر غور کیا جائے۔ مناسب اور ضروری یہی معلوم ہوتا ہے کہ "خزانۂ رحمت" کے برہان پور کے نسخہ سے متعلق کتاب "سخنورانِ گجرات" کے مصنف جناب سیّد ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم [ابنِ سیّد حمید الدین حشمت مرحوم متوفی ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء] نے جو باتیں لکھی ہیں ان کو تازہ کر لیا جائے تاکہ اس سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کر سکوں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ میرے الفاظ میں یہ ہے۔
سیّد مطیع اللہ راشدؔ برہان پوری مرحوم ابنِ محمّد فضل اللہ مرحوم [۱۹۶۰-۱۸۹۷ء] سے ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مرحوم کو سنہ ۱۹۴۲ء میں معلوم ہوا تھا کہ برہان پور میں مشائخ خاندان کے ایک شخص محمّد رفیع الدین کے کتب خانے میں "خزانۂ رحمت" کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے راشدؔ صاحب کے توسط سے اس نسخے کو حاصل کرنے کی ہر چند کوشش کی لیکن انھیں نسخہ نہیں ملا۔
بعد میں راشدؔ صاحب کو جب "خزانۂ رحمت" کا وہ نسخہ دستیاب ہوا تو انھوں نے اس میں سے شاہ باجن کا ہندی کلام نقل کر کے پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم کے پتہ سے بمبئی بھیجا جس کا علم مدنی صاحب کو نہ ہو سکا۔ لیکن بعد میں یہ ہندی کلام ڈاکٹر مدنی مرحوم کو پروفیسر صاحب کے قلمی ذخیرے میں ملا۔ اس سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۷۰ء میں "نوائے ادب" [انجمن الاسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی] کے اکتوبر ۱۹۷۰ء کے شمارے میں برہان پور کے مایہ ناز ریسرچ اسکالر ڈاکٹر شیخ فرید

صاحب [ابنِ غلام محمد صاحب مرحوم] کا ایک مضمون بعنوان ''شاہ باجن حالات اور ہندی کلام'' شائع ہوا تھا۔ جو بقول ڈاکٹر مدنی مرحوم حضرت مولوی سیّد احکام اللہ بخاری مرحوم متوفی ۱۳۸۸ھ\۱۹۶۶ء ابنِ حضرت مولوی سیّد انعام اللہ [متوفی ۱۳۲۹ھ\۱۹۱۱ء مدفون شاہی جامع مسجد برہان پور] کے مملوکہ ''خزانۂ رحمت'' کے نسخے کے پیشِ نظر سپردِ قلم کیا گیا تھا۔

مولوی محمد رفیع الدین والا نسخہ ان کی وفات کے بعد مذکوری خطیب و پیش امام حضرت سیّد احکام الدین صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ کر دیا گیا۔

یہ باتیں ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی مرحوم نے اپنی کتاب '''''سخنورانِ گجرات'' میں لکھی ہیں جو ۱۹۸۱ء میں ترقی اردو بیورو' نئی دہلی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

اتنی تفصیل لکھنے کے بعد میں ان باتوں کے پیشِ نظر کچھ باتیں قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے لکھنا چاہتا ہوں تاکہ آگے تحقیق کرنے والوں کو آسانی اور سہولت ہو۔ اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں کچھ اہم اور ضروری باتیں آپ کے گوش گذار کروں مناسب یہی معلوم ہوتا کہ پہلے میں آپ کو یہ بتاؤں کہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم نے جن مولوی سیّد محمد رفیع الدین مرحوم کا ذکر کیا ہے وہ کون ہیں ؟ اور برہان پور کے کس مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ؟ اور ان کے آباء و اجداد کون تھے ؟ اور آخر میں ایک اہم سوال یہ کہ ان کے ذاتی کتب خانے میں ''خزانۂ رحمت'' کا وہ نایاب نسخہ کب اور کس کے ذریعے آیا تھا؟ اور مولوی صاحب موصوف کے بعد کیسے برہان پور کے شاہی مسجد کے مرحوم خطیب و امام حضرت مولوی سیّد احکام اللہ بخاری کے ذاتی کتب خانے میں پہنچا؟ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے جب کہ برہان پور دار السرور میں مسلم بادشاہت کا خاتمہ مکمل طور پر ہو چکا تھا اور مراٹھوں کی عمل داری [۱۱۷۳ھ سے ۱۲۷۸ھ تک] تھی تو یہاں بڑی اور نامور درسگاہوں کی بربادی کے بعد بھی ایک بڑی درسگاہ مدرسہ مسجد [محلّہ بدھوارہ] میں باقی رہ گئی تھی۔ جس میں ایک جیّد عالم سیّد محمد غلام شاہ طالبانِ علم و عرفان کو مختلف علوم میں درس دیا کرتے تھے۔ یہ درسگاہ اس زمانے میں کتنی مشہور و معروف تھی اس کا اندازہ آپ اس بات سے کیجئے کتاب برہان پور کے مایہ ناز مصنف جناب مولوی معین

الدین صاحب ندوی [مدفون درگاہ مسیح اولالیا حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ] نے اپنی مذکورہ کتاب میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"دارالسرور برہان پور کی شان دار علمی ترقی میں یہاں کی درسگاہوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ مدرسہ کی مسجد بدھوارہ میں سیّد غلام محمد صاحب عربی کی اعلیٰ تعلیم دیتے تھے۔ مدرسہ کے اخراجات کے لئے حیدر آباد کے نواب ناصر جنگ کی طرف سے ایک لاکھ سالانہ ماحصل کی جاگیر تھی۔ جب مراٹھوں کے راج میں یہ جاگیر ضبط ہوئی تو ریاست بھوپال کی جانب سے دو سو روپیوں ماہوار کا وظیفہ جاری ہوا تھا۔" [۳۹۔۴۰] ویسے اس درگاہ کو شاہ غلام محمد نے قائم کیا تھا اور مدرسہ، مسجد بھی انھیں کی قائم کردہ ہے۔ مگر اس مدرسہ کے شہرت اپنی انتہا کو اس زمانے میں پہنچی جب یہاں ایک مشہورِ زمانہ عالم شاہ محمد اسمٰعیل عبّاسی نے درس دینا شروع کیا۔ مولوی اسمٰعیل عبّاسی کتنے زبردست عالم و فاضل تھے اس کا اندازہ آپ اس بات سے کیجئے کہ "تاریخ برہان پور" کے قابلِ صد احترام مصنّف مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم [متوفی حیدر آباد] نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"برہان پور میں کوئی عالم اس وقت ان کے برابر کا نہ تھا۔ حکیم لاثانی مولوی محمد اسحاق صاحب برادر خوردان کے تھے اور مسجد واقع چوک میں رہتے تھے۔" اسی مسجد چوک کو مرحوم مولوی محمد اسمٰعیل عبّاسی کے ایک شاگرد مولوی سیّد قدرت اللہ نے مولوی صاحب کا جانشین ہونے کے بعد ۱۲۳۸ھ میں نئے سرے سے بنوایا۔ جنکی تاریخ برہان پور کے مشہور شاعر یکدمؔ نے یوں بیان کی ہے:

بنام حضرت حق ابتدا شد
کہ ایں مسجد بنا بہر خدا شد
فدا کن جانِ جاں یکدمؔ بریں قول
کہ زود از قدرت اللہ این بنا شد

[۱۲۳۸ھ]

اسی سال یعنی ۱۲۳۸ھ میں مولوی سیّد قدرت اللہ واصلِ الٰہی ہوگئے۔ کیوں کہ آپ لاولد تھے اس لئے آپ کے جانشین آپ کے رشتہ دار مولوی سیّد میر صاحب ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان

کے فرزند مولوی سیّد سعادت میر قائم مقام ہوئے۔ مولوی سیّد محمد میر کی وفات ۱۲۵۷ھ میں ہوئی۔ مولوی سیّد سعادت میر کی تین اولادیں تھیں دو فرزند اور ایک دختر۔ فرزندوں کے اسمِ گرامی تھے المعروف مولوی فیض الدین اور ہدایت میر المعروف مولوی بشیر الدین۔ دختر کا نام سیّدہ سکینہ تھا مولوی فیض الدین جو کہ وفات پانے کے بعد برہان پور کی دہلی والی مسجد [محلّہ چندر کلاں] میں مدفون ہوئے اپنے پیچھے دو فرزند چھوڑ گئے ایک مولوی رشید الدین، جو کہ مجذوب تھے بعدِ وفات بہادر پور کے مشہور روحانی بزرگ حضرت شہا محمد دولہ کی درگاہ میں مدفون ہوئے ان کے چھوٹے بھائی مولوی خلیل الدین تھے جن کی چار اولادیں تھیں دختر محترمہ فردوس بیگم صاحبہ، فرزند سیّد عبّاس علی، دختر افروز بیگم اور فرزند سیّد محمد علی عرف بجّو میاں۔ ان میں سے دونوں فرزند سیّد عبّاس علی اور سیّد محمد علی وفات پا چکے ہیں اور دونوں دختر فردوس بیگم صاحبہ اور افروز بیگم صاحبہ خدا کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں۔ محترمہ فردوس بیگم صاحبہ [عمر پچیاسی سال] برہان پور کی ایک عظیم مرحوم شخصیت آلِ رسول کی بیوہ ہیں اور محترمہ افروز بیگم صاحبہ برہان پور کے ایک نوآب خاندان نوآب سیّد احمد الدین ایڈوکیٹ کی بڑی بہو ہیں۔ یوں تو مذکورہ شجرہ کی سبھی شخصیتیں ہمارے لئے قابلِ توجہ ہیں لیکن ان میں جو خاص ہمارے لئے اس وقت توجہ کا مرکز ہیں وہ ہستی مولوی بشیر الدین مرحوم کی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں برہان پور میں جناب بشیر الدین مرحوم کا مشائخ خاندان بڑا مشہور تھا۔ ہر کوئی ان سے واقف تھا۔ کیوں کہ مولوی صاحب مرحوم عالم و فاضل ہی نہ تھے بلکہ نامی گرامی مولوی بھی تھے۔ وہ وعظ لاجواب کہتے تھے، اس لئے دور دور تک مشہور تھے۔ انہی مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم کے واحد چشم و چراغ مولوی سیّد رفیع الدین تھے۔ جو اپنے والدِ محترم کی طرح علم و فاضل اور مشہور مولوی تھے۔ جو بہترین وعظ کیا کرتے تھے۔ برہان پور کے بزرگوں کا آپ سے متعلق کہنا ہے کہ آپ بہت ہی لحیم و شحیم تھے۔ لیکن دماغ بہت ہی اعلیٰ قسم کا اور طبعیت انتہائی سیدھی سادی اور مزاحیہ پائی تھی۔ جو سنجیدہ وعظ کہنے میں اپنے جوہر دکھاتی تھی۔ ان کے اور ان کے والد بزرگوار کے وعظ کہنے کے اندازِ بیاں کے سلسلے میں بزرگانِ برہان پور کا یہ کہنا ہے کہ جہاں مولوی بشیر الدین

الدین مرحوم سنجیدہ اور عالمانہ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ وہیں ان کے فرزند مولوی رفیع الدین مرحوم کا وعظ سنجیدہ اور عالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ پُر مذاق بھی ہوا کرتا تھا۔ دورانِ وعظ آپ اپنے بہترین اور دلکش انداز میں ایسی بات یا واقعہ بیان کرتے تھے کہ بھری محفل زعفران زار بن جاتی تھی۔ سننے والے ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے تھے۔ وہیں دل سے متاثر بھی ہوتے تھے۔ اپنے دلکش انداز میں وعظ کہنے کی خوبی ان کی پہچان تھی جو انھیں اس زمانے کے دیگر علماء میں ممتاز و مقبول بنائے ہوئی تھی۔ اور آج بھی برہان پور کے وہ بزرگ جنھوں نے آپ کو وعظ کہتے سنا ہے ان کے دلکش اندازِ بیان کی دل کھول کر تعریف کرتے ہوئے آپ کو یاد کرتے ہیں۔

ان کی رہائش گاہ محلہ چوک بازار [انڈا بازار] کے بزاز بنانے والی گلی کے نکڑ پر تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ کی رہائش گاہ کے نیچے کے حصے میں دو کانیں بنی ہوئی تھیں اور آپ اوپر والی منزل پر رہتے تھے۔ رہائش گاہ سے ملی ہوئی آپ کی بہت بڑی جائیداد تھی جو کئی دوکانوں اور مکانوں پر مشتمل تھی۔ ان میں ان کی ذاتی مسجد بھی تھی۔ جائیداد تو کچھ ان کی حیات میں اور کچھ ان کی وفات کے بعد بک گئی۔ لیکن ان کی ذاتی مسجد اب بھی موجود ہے اور چوک مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد آج کل برہان پور کے مشہور و معروف اور پیر بزرگ جناب عبد الغفور صاحب مرحوم مدفون بہور اشرفی برہان پور] کے جانشین جناب پیر مشتاق اشرفی کے زیرِ اہتمام ہے۔ مولوی سیّد رفیع الدین صاحب مرحوم کی پہلی شادی بیاول ضلع جلگاؤں مہاراشٹر کے قاضی عبد القادر صاحب کی صاحب زادی سعادت بیگم سے اور دوسری شادی برہان پور کے مشہور ایڈوکیٹ جناب سیّد احمد الدین مرحوم ابنِ نواب سیّد حمید الدین کی صاحب زادی سیّدہ محمودہ بیگم سے ہوئی تھی۔ نواب سیّد احمد الدین اورنگ آباد کے مشہور حکیم سیّد حمید الدین مرحوم کے اکلوتے فرزند تھے۔ جن کی نوابی میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ اورنگ آباد میں ان کے خاندان کے نام پر ایک محلہ نواب پورہ بسا ہوا ہے اور برہان پور میں محلہ چندر کلاں میں جتنے بھی رہائشی مکانات ہیں ان میں سے زیادہ تر مکانات انھیں نواب سیّد احمد الدین کی ذاتی زمین پر بسے ہوئے ہیں و ّاب صاحب نواب نے بھی اپنی زندگی میں اپنی قیمتی زمین بہت ہی کم قیمت پر رہائش کے لئے لوگوں کو نہ صرف یہ کہہ کر دے دی بلکہ ان کے نام رجسٹری بھی

بھی کر دی ہے۔ کہتے ہیں کہ کئی غریب لوگوں کو رجسٹری کروانے کے لئے پیسے بھی اپنے پاس سے دیئے ہیں۔ برہان پور میں آپ کی نوابی کے کئی قصے لوگوں کو اب بھی یاد ہیں۔ ان کے نوابی قصوں میں یہ بات خاص طور پر بیان کی جاتی ہے کہ جب نواب سیّد احمد الدین مرحوم کی شادی ہوئی تھی تو برہان پور میں شہر بھر کا کھانا ہوا تھا اور کھانا بنانے اور کھلانے کے لئے سارے برتن ان کے گھر کے استعمال میں لائے گئے تھے۔ یعنی ان کے یہاں برتنوں کا ایک انبار تھا۔

نواب صاحب مرحوم برہان پور کے عمائدین شہر میں نہ صرف یہ کہ سب سے زیادہ باعزت انسان تھے بلکہ ایک اچھے وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ پر خلوص سیاسی رہنما بھی تھے جنھوں نے مرتے دم تک عوامی خدمات انجام دیں۔۔ ان کے تین فرزند نواب حفیظ الدین' حبیب انجم اور عارف میاں خدا کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں۔ نواب حفیظ الدین ہاکی کے بہترین کھلاڑی ہونے کی وجہ سے برہان پور میں کافی مشہور ہیں۔ اور اب تو وہ خدا کے فضل سے پچھتر برس کے ہوگئے ہیں۔ لیکن جب وہ میری طرح جوان تھے تو ہاکی اتنی اچھی کھیلتے تھے کہ لوگ انھیں ''بجلی'' کہنے لگے تھے۔ اور اب بھی لوگ انہیں حفیظ الدین بجلی کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ میرے بڑے کرم فرما ہیں کیوں کہ میرے بڑے بھائی شیر محمد خان عرشی حال مقیم شہر اندور کے وہ دوست رہ چکے ہیں اس لئے وہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ ان سے ایک دن جب میں نے ''خزانۂ رحمت'' کے اس بیش بہا نسخے کے بارے میں دریافت کیا جو بقول ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم ان کے بہنوئی مولوی سیّد رفیع الدین مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں تھا اور جو بعد میں مولوی صاحب کی وفات کے بعد برہان پور کی شاہی مسجد کے مرحوم خطیب و پیش امام جناب مولوی سیّد احکام اللہ صاحب کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ رکھنے کے لئے دے دیا گیا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں نواب حفیظ الدین نے مجھ سے کہا کہ ہاں' اختر میاں! یہ بات صحیح ہے کہ مولوی سیّد رفیع الدین میرے بہنوئی تھے ان سے میری سگی چھوٹی بہن سیّد محمودہ بیگم بیاہی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں مولوی صاحب اپنے موروثی مکان واقع محلہ چوک بازار میں رہتے تھے۔ انڈا بازار میں جو مسجد چوک کے نام سے مشہور ہے وہ ان کی ذاتی مسجد تھی۔ اس مسجد سے لگی ہوئی جو دوکانیں شمال کی طرف ہیں ان کے اوپر ان کی رہائش گاہ تھی۔ جس میں ان کا ذاتی

کتب خانہ بھی تھا۔اسی کتب خانے میں ''خزانۂ رحمت ''کاوہ نسخہ بھی تھاجس کے بارے میں آپ نے مجھ سے دریافت کیا ہے۔ اس ''خزانۂ رحمت'' کو دیکھنے کا شرَف ہمارے خاندان میں جن لوگوں کو ہے ان میں 'میں بھی ایک ہوں اس نسخے کو میں نے اپنی زندگی میں کئی بار دیکھا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میرے بہنوئی مولوی رفیع الدین نے یہ نسخہ میرے والد بزرگوار کو دکھانے کے لئے ایک دِن میرے گھر واقع چندر کلاں لائے تھے۔تب میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس نسخے کو دیکھنے کا شرَف حاصل کیا تھا۔یہ نسخہ میرے والد صاحِب کے پاس کئی دِنوں تک رہاوہ اس کا مطالعہ کرتے تھے۔میں نے بھی اسے پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی۔

ایک مرتبہ میں اپنے بہنوئی مولوی صاحِب مرحوم کے ساتھ بمبئی گیا تھا۔''خزانۂ رحمت ''کا یہ مذکورہ نسخہ ان کے ساتھ تھا۔انھوں نے یہ نسخہ بمبئی کے ایک ایسے عالم کو دکھایا تھاجو جرمن نژاد تھااور بہت سی زبانوں کا ماہر تھا۔اس نے اس نسخے کو دیکھنے کے بعد مولوی صاحِب مرحوم سے کہا تھا کہ یہ بہت زیادہ قیمتی ہے مگر افسوس اس کے آخری صفحات نہیں ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آخری صفحات نکال لئے گئے ہیں۔اگر یہ صفحات بھی اس کے ساتھ ہوتے تو یہ لاقیمت ہوتا۔پھر بھی اس کو محفوظ رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔بعد میں یہ نسخہ لے کر ہم برہان پور آگئے تھے۔اس کے کچھ دِنوں بعد مولوی صاحِب مرحوم سخت بیمار ہوگئے ان کی حالت جب زیادہ خراب ہوگئی تو انھیں میرے والد بزرگوار ہمارے گھر لے آئے اور ہمارے دیوان خانے میں ان کا بستر لگادیا گیا۔انتقال سے قبل مرحوم مولوی صاحِب نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ''خزانۂ رحمت'' کے اس نسخے کو برہان پور کی شاہی مسجد کے پیش امام حضرت مولوی سیّد احکام اللہ مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ کرادینا چاہتے ہیں۔جب انھوں نے دو تین مرتبہ اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو پھر والدِ مرحوم نے اس کا ذکر مذکورہ پیش امام صاحِب سے کیا جن سے والدِ مرحوم کے گہرے مراسم تھے۔پیش امام صاحِب نے اپنے سگے بھتیجے اور داماد جناب ڈاکٹر حکیم شمس التوحید مرحوم [متوفی ۱۳۹۸ھ\۱۹۷۸ء، سابق میونسپل کونسلر نگرپالیکا برہان پور ابنِ سیّد طالب اللہ متوفی ۱۳۷۴ھ\۱۹۵۴ء، مدفون [شاہی مسجد برہان پور] کو ہمارے گھر بھیجااوران کے

آنے پر میرے بہنوئی مولوی سیّد رفیع الدین مرحوم نے "خزانۂ رحمت کا مذکوری نسخہ انہیں اپنے ذاتی کتب خانے میں محفوظ رکھنے کے لئے دے دیا۔

یہ بات مولوی صاحب مرحوم [محمد رفیع الدین] کی وفات کے ایک یا دو دِن پہلے کی ہے۔ سن ۱۹۴۹ء میں مولوی صاحب کی وفات ہوئی اور انھیں ہماری ذاتی مسجد دہلی والی مسجد میں دفن کیا گیا۔ یہ مسجد محلہ چندر کلاں میں حضرت برہان الدین رازِ الٰہی کی درگاہ سے چند مکانات پہلے سڑک کے کنارے واقع ہے۔ جس کے موجودہ متولی میرے فرزند ہیں۔

اس کے ساتھ نواب حفیظ الدین صاحب نے بھی مجھ سے کہا کہ "خزانۂ رحمت" کا مذکورہ نسخہ بمبئی لے جانے کی بات آج سے چالیس پچاس برس پہلے کی ہے۔ بمبئی لے جانے سے قبل یہ نسخہ برہان پور کے مشہور شاعر اور ادیب جناب سیّد مطیع اللہ راشدؔ مرحوم کو بھی مطالعہ کے لئے میرے بہنوئی مولوی سیّد رفیع الدین نے دیا تھا جو انھوں نے کچھ دِنوں بعد ہی مولوی صاحب کو واپس کر دیا تھا یہ بات میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جب استاد راشدؔ مرحوم کو "خزانۂ رحمت" کا مذکورہ نسخہ مطالعہ کے لئے دیا گیا تھا تو اس کے آخری صفحات اس کے ساتھ لگے تھے یا نہیں لگے تھے۔ اسی طرح میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ راشدؔ مرحوم نے جب "خزانۂ رحمت" کا نسخہ مولوی صاحب مرحوم کو واپس کیا تھا تو وہ پہلے کی طرح مکمل تھا یا نہیں تھا۔ کیوں کہ ہم میں سے کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا یہ بات تو ہمیں بمبئی میں اس جرمن نژاد عالم نے بتائی تھی کہ اس کے آخری صفحات کسی نے اس میں سے نکال لئے ہیں۔ اس لئے میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ اب یہ آخری صفحات کہاں ہیں؟

نوّب حفیظ الدین صاحب سے میری یہ بات چیت قریب سات آٹھ ماہ پہلے ہوئی تھی۔ موصوف نے تقریباً یہی بات میرے ایک دوست سیّد محمد فاروق سے بھی کہی تھی۔ سیّد محمد فاروق قادری برہان پور کے ایک مشہور مشائخ خاندان یٰسین عرف غریب نواز [خانقاہ نند دربار] کے فرد جناب سیّد اسرار اللہ قادری مرحوم کے فرزند ہیں جنھیں علم و ادب کے ساتھ تاریخ سے اچھی خاصی دلچسپی ہے خاص طور سے انھیں بزرگانِ دین کے حالات جاننے کا بے حد شوق ہے جس کے لئے وہ خود کو ہر وقت مشغول رکھتے ہیں اور کوشاں رہتے ہیں کہ انھیں روحانی بزرگوں کے واقعاتِ زندگی زیادہ سے

زیادہ معلوم ہو جائیں۔اس لئے وہ اکثر میری دوکان پر آتے ہیں اور بزرگانِ دین سے متعلق سوال و جواب کرتے ہیں وہ طبیہ کالج برہان پور کے طالبِ علم ہیں۔جب "ہماری زبان" میں میرا مضمون "خزانۂ رحمت" ۸ اور ۱۶ جنوری کی اشاعتوں میں شائع ہوا تو اسے پڑھ کر انھیں مرحوم مولوی سیّد رفیع الدین سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا خیال آیا وہ میرے پاس آئے اور مجھ سے دریافت کیا۔میں نے انھیں مذکورہ بات تفصیل سے بتا دی۔اس کے بعد انھوں نے تصدیق کے لئے نواب حفیظ الدین صاحب سے ملاقات کی جس پر انھوں نے ان سے وہی کچھ کہا جو وہ مجھ سے کہہ چکے تھے۔بعد ازاں فاروق صاحب نے کتاب "شاہ بہاؤالدین باجن" جن کے مصنف اور برہان پور کے مشہور محقق شیخ فرید صاحب سے بھی ان کے دولت کدہ [واقع محلہ چندر کلاں برہان پور] جا کر ان سے ملاقات کی۔حالانکہ ڈاکٹر صاحب موصوف کئی مہینوں سے صاحبِ فراش [فالج] تھے پھر بھی انھوں نے فاروق صاحب سے بخوشی باتیں کیں۔اور اس بات کی تصدیق کی کہ "سخنورانِ گجرات" میں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم نے "خزانہ رحمت" سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے اور یہ بات بھی صحیح اور درست ہے کہ "خزانۂ رحمت" کا مذکورہ نسخہ برہان پور کی شاہی جامع مسجد کے اس وقت کے مرحوم خطیب و امام حضرت مولوی سیّد احکام اللہ بخاری کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ رکھنے کے لئے دیا گیا ہے۔یہ بات نہ صرف مجھے معلوم ہے بلکہ میں نے مذکورہ امام صاحب کی بے پناہ عنایت سے ان کے ذاتی کتب خانہ میں بیٹھ کر اس کی پوری نقل کی ہے ساتھ ہی میں نے ان کی اجازت و رضامندی سے دیگر نادر الوجود کتابوں اور بیش قیمت ملفوظات کی نقل بھی کی ہے۔اس سوال کے جواب میں کہ آپ نے مذکورہ امام کے ذاتی کتب خانے کی نادر الوجود کتابوں اور ملفوظات کی نقلیں کی ہیں اب وہ کہاں ہیں؟ ڈاکٹر موصوف نے فرمایا کہ سبھی نقلیں اور "خزانۂ رحمت" کے دیگر نسخوں کی زیراکس اور میرے لکھے مسودات اور نوٹس میں نے احمد آباد اور حیدر آباد کے تعلیمی اور علمی اداروں کو دیئے ہیں اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ "خزانۂ رحمت" کا نسخہ ۱۹۴۲ء کے آس پاس مولوی سیّد رفیع الدین مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ تھا جو ان کی وفات کے بعد مولوی سیّد احکام

اللہ بخاری مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں دے دیا گیا۔ اس بات میں اور کتاب ''سخنورانِ گجرات'' میں جو کچھ لکھا ہے اس میں کچھ فرق نہیں سوائے اس لئے کہ ''سخنورانِ گجرات'' میں ڈاکٹر مدنی مرحوم نے لکھا ہے کہ ''خزانۂ رحمت'' کا نسخہ مولوی محمد رفیع الدین مرحوم کی وفات کے بعد مذکورہ پیش امام صاحب کے ذاتی کتب خانے میں دے دیا گیا اور نواب حفیظ الدین صاحب کے مطابق مذکورہ پیش امام صاحب کے سگے بھتیجے اور داماد جناب سیّد شمس التوحید مرحوم کے انتقال سے پہلے مولوی سیّد محمد رفیع الدین مرحوم نے خود اپنے ہاتھوں سے دے دیا تھا۔

اس سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ علامہ سیّد مطیع اللہ راشدؔ مرحوم کو آج سے پچاس سال پہلے ۱۹۴۵ء کے آس پاس ''خزانۂ رحمت'' کا نسخہ دستیاب ہوا تھا اور انھوں نے اس میں سے حضرت شاہ باجن کا ہندی کلام نقل کر کے ڈاکٹر مدنی مرحوم کو پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم کے پتے پر بمبئی بھیجا تھا جو بعد میں مدنی مرحوم کو پروفیسر ندوی مرحوم کے قلمی ذخیرے میں ملا تھا۔ اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ علامہ راشدؔ مرحوم کو ''خزانۂ رحمت'' کا نسخہ دستیاب ہوا تھا تو کیا وہ ''نامکمل'' تھا؟ اور اس کے آخری صفحات اس میں نہیں تھے؟ اگر تھے تو پھر وہ صفحات کیا ہوئے؟ اور تیسرا سوال یہ کہ وہ صفحات شاہ باجن کے ہندی کلام پر مشتمل تھے؟ جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کلام کے صفحات شاہ باجن کے ہندی کلام پر مشتمل تھے۔ اگر وہ صفحات شاہ باجن کے ہندی کلام پر مشتمل نہیں ہیں تو پھر ان صفحات پر حضرت شاہ باجن نے کیا تحریر فرمایا ہے؟ یہ ایک تحقیق طلب بات ہے اس کی تحقیق کی جانی چاہئے۔

اور آخر میں ایک سوال اور۔۔ وہ یہ کہ کیا استاد راشدؔ مرحوم نے ''خزانۂ رحمت'' کا مطالعہ کرنے کے بعد مولوی محمد رفیع الدین مرحوم کو خزانۂ رحمت'' کا نسخہ وعدے کے مطابق جوں کا توں واپس کر دیا تھا؟ اگر ہاں' تو پھر اس نسخے کے آخری صفحات کیا ہوئے؟ یہ بات بھی تحقیق طلب ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ ان صفحات میں حضرت شاہ باجن کا وہ ہندی کلام تحریر کیا ہوا ہے جو استاد راشدؔ مرحوم نے ڈاکٹر مدنی مرحوم کو بمبئی بھیجا تھا تو پھر یہ قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفحات کسی وجہ سے استاد راشدؔ مرحوم ہی کے پاس رہ گئے۔ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ صفحات

رہ گئے۔یا پھر انھوں نے [راشدؔ مرحوم نے]یہ سوچ کر ان صفحات کو اپنے پاس رکھ لیا کہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم کے لئے نقل کرنے کے بعد مولوی صاحب موصوف کو واپس کردوں گا۔اور پھر نقل کرنے کے بعد ان صفحات کو واپس کرنے کا انھیں موقع نہ ملا ہو۔اس طرح یہ صفحات ان کے پاس رہ گئے ہوں اور ان کے ساتھ کراچی چلے گئے ہوں اگر یہ قیاس صحیح ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "خزانۂ رحمت" کے آخری صفحات کا وجود ہے۔یہاں میں ماضی کا صیغہ "تھا" استعمال کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ یہ صفحات کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہیں۔ایک نہ ایک دِن ان کا پتہ ضرور چلے گا بشرطیکہ ہم سچّی لگن اور یقینِ کامل کے ساتھ ان کی تلاش و جستجو کریں۔

استاد راشدؔ مرحوم اردو' فارسی اور عربی کے کتنے زبردست عالم تھے اس کا اندازہ اس مقدمے سے ہوتا ہے جو آپ نے سندھ کے مایہ ناز شاعر ملا عبدالحکیم عطاؔ کے دیوان کے لئے تحریر فرمایا تھا۔آپ ہی نے فارسی زبان کے اس عظیم شاعر کے دیوان کو بڑی عرق ریزی اور دماغ سوزی کے بعد ترتیب دیا ہے جسے پاکستان کا کوئی عالم و ادیب ترتیب نہیں دے سکا تھا۔یہ تو استادِ محترم ہی کا کارنامہ تھا کہ آپ نے مذکورہ شاعر کے ایک لاکھ اشعار میں رات دِن اپنا دماغ لگا کر دیوان ترتیب دیا۔یہ استادِ محترم کی زبردست علمیت و قابلیت کا بیّن ثبوت ہے استادِ محترم کو اسے تصیح و تصریح کرکے ترتیب دینے میں کتنی دقتوں اور پریشانیوں سے گذرنا پڑا تھا اسے استادِ محترم نے ملا عبدالحکیم کے تین سو سال پرانے مخطوطے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ان الفاظ میں لکھا ہے:

"شاعر کو بسا اوقات بے پناہ آمد کے موقعہ پر ایسا بھی کرنا پڑتا ہے کہ اُمڈ کر آئے مضامین کو کسی بھی صورت میں کاغذ پر منتقل کر کے آگے بڑھتا رہے۔شاید عطاؔ نے ایسا ہی کیا ہے۔کیوں کہ مخطوطے میں ایسی تحریریں کئی جگہ ہیں۔اوّل تو جگہ ناموزوں' دوم خط شکستہ' پھر قلم انتہائی باریک' اس پر برق رفتاری سے زود نویسی۔یہ تحریریں ایسی مغلق اور غیر الفہم ہیں کہ میں بھی جو ہر قسم کا شکستہ اور پیچیدہ خط بڑی آسانی سے پڑھ لیا کرتا ہوں بے حد دماغ سوزی اور دماغ و ذہن کی انتہائی توانائیوں کو بروئے کار لا کر بدقت تمام ہفتوں دردِ سری کر کے پڑھ سکا۔

یہ مبالغہ نہیں ہے، مخطوط موجود ہے، دیکھ کر اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے، ہاں میں کہہ رہا تھا کہ یہ مخطوط مصنف کا خود نوشت مکتوب ہے اور میں اس کو ثابت بھی کر آیا ہوں۔"

تحریر زد ہیچمداں سید مطیع اللہ راشد برہان پوری السندی

یہاں اس بات کو بھی لکھنا مناسب اور ضروری خیال کرتا ہوں کہ برہان پور سے ہجرت کر کے کراچی چلے جانے کے بعد بھی علامہ سیّد مطیع اللہ راشد مرحوم نے نہ صرف یہ کہ اپنے ادبی مشاغل وہاں بھی جاری رکھے تھے، بلکہ کئی ادبی، تاریخی مضامین، مقالے اور مقدمے، غزلیں، نظمیں لکھنے کے ساتھ ساتھ کئی گراں قدر کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ جن میں سے "برہان پور کے سندھی اولیاء" اور "تحفۃ المرسلہ" شائع ہو کر ادبی حلقوں سے تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ کتاب "برہان پور کے سندھی اولیاء" جیسا کی نام سے ظاہر ہے برہان پور کے ان سندھی بزرگانِ دین کے حالاتِ زندگی پر جامع اور مکمل کتاب ہے، جنھوں نے ۹۸۰ھ کے آس پاس سندھ [پاکستان] سے برہان پور آکر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور یہاں رہ کر نہ صرف یہ کہ بڑی علمی اور ادبی خدمات انجام دی تھیں بلکہ ایک درسگاہ قائم کر کے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی عمر بھر جاری رکھا تھا اور طالبانِ علم و عرفان کو درس و تدریس کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت سے بھی نوازا تھا۔ اس گراں قدر تصنیف کو پیش کر کے استاد راشد مرحوم نے جہاں برہان پور دارالسرور کا نام دنیا بھر میں روشن کیا وہیں اپنے ہم وطنوں کے لئے سامانِ فخر و ناز بھی فراہم کیا ہے۔ استاد راشد برہان پوری کی دوسری کتاب "تحفۃ المرسلہ" برہان پور کے مشہور روحانی بزرگ حضرت محمد بن فضل اللہ [متوفی رمضان المبارک ۱۰۲۹ھ دوشنبہ، برہان پور] کی مشہور کتاب "تحفۃ المرسلہ [عربی] کا ترجمہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو اپنے آبائی وطن برہان پور دارالسرور سے کتنی والہانہ محبت اور اپنے ہم وطنوں سے کتنا دلی لگاؤ تھا اس کا احساس بھی مقدمے کے آخری صفحات کو پڑھنے سے اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے وطن اور ہم وطنوں کی پر خلوص محبت میں ڈوب کر خود کو خاکِ وطن اور خاکسارانِ وطن لکھا ہے مقدمے کا یہ آخری صفحہ آپ کے دلی جذبات و احساسات کا آئینہ ہے جس کی عبارت کو ذیل میں لکھتے

ہوئے فخر وناز کے ملے جلے جذبات اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں۔

"سندھی ادبی بورڈ کراچی" سے باہمی معاہدہ کے مطابق پہلا ایڈیشن میں اس مقدمے کا سندھی ترجمہ دیوان کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ چونکہ احباب برہان پور سندھی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے اردو مقدمے والا ایڈیشن نہ جانے کتنی تاخیر سے شائع ہو میں نے اپنے احبابِ وطن کو اردو کی اصل کاپی بورڈ سے عاریتاً لے کر بحالتِ شدید ضعف رواں دواں خط میں نقل کر دیا۔ امید ہے میری یہ خطی یادگار یارانِ وطن کے ذوق کی تسکین اور ان کی دلچسپی و مسرت کا باعث ہو گی۔

خاکسارانِ وطن کا فدائی راشد برہان پوری عفی اللہ عنہ'

مورخہ ۲۹ ربیع الاوّل ۷۷ ۱۳ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء

یہ استاد راشد کا ایک طویل مقدمہ ہے جو بڑی سائز کے ۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ "دیوانِ عطا" مع مقدمے کے شائع ہو چکا ہے یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ یہ مقدمہ جو کہ استادِ محترم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس وقت میرے پاس ہے جو میرے مخلص دوست اور استاد راشد مرحوم کے عزیز شاگرد مخدوم جابر برہانی صاحب نے ملاحظہ کے لئے عنایت کیا ہے۔

اپنے آخر وقت میں استاد راشد مرحوم اپنا قیمتی ذخیرہ برہان پور کے اپنے احباب کے حوالے کر دینا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے اپنے شاگرد مخدوم جابر صاحب کو خط بھی لکھا تھا مگر افسوس بیماری نے انھیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنا قلمی ذخیرہ جابر صاحب کو بھیجتے اور وہ واصلِ رحمتِ الٰہی ہو گئے۔

اس کے بعد اس سلسلے میں مخدوم جابر صاحب نے ان کے سگے بھتیجے اور داماد حبیب اللہ مرحوم کو خط لکھا اور اس کے ساتھ استاد راشد مرحوم کا مذکورہ خط بھی بھیجا تو انھوں نے استاد راشد مرحوم کے قلمی ذخیرے میں سے بہت تھوڑا حصہ مخدوم جابر صاحب کو اپنے ایک رشتے دار کے ذریعے برہان پور بھیجا تھا جو جابر صاحب کو ۱۹۸۴ء کو مل گیا تھا۔ اب اس قلمی نسخے کو کس طرح محفوظ کیا جائے؟ جب اس پر خیال آرائیاں شروع ہوئی تو مخدوم جابر نے استاد راشد مرحوم کے شاگردوں اور ماننے والوں کی ایک ملی جلی میٹنگ میرے محلہ خانقاہ وارڈ میں عباس علی کشش کے مکان پر کی جس کی صدارت استاد راشد مرحوم کے جانشین استاد شفق برہان پوری [متوفی برہان پور] نے فرمائی تھی۔ اس میٹنگ

میں مخدوم جابر صاحب نے وہ تمام مسودات اور کاغذات جملہ حاضرین کے ملاحظہ کے لئے رکھ دیئے جو انھیں اپنے استاد کی جانب سے دستیاب ہوئے تھے۔ میٹنگ میں کیا صلاح مشورے ہوئے اور کیا فیصلے ہوئے وہ ہمارے لئے اتنے اہم نہیں جتنا یہ اہم ہے کہ کیا راشؔد مرحوم نے وہ مسودات اور کاغذات میں "خزانۂ رحمت" کے وہ آخری صفحات بھی برہان پور بھیجے تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ استاد راشؔد مرحوم اپنے ساتھ کراچی لے گئے تھے؟

مخدوم جاؔبر صاحب جن کا ذکر استاد مطیع اللہ راشؔد برہان پوری اپنی گراں قدر تصنیف "برہان پور کے سندھی اولیاء میں کیا ہے۔ میرے ان دوستوں میں ہیں جن کو میں اپنا بہت ہی قریبی دوست کہہ سکتا ہوں ہم پچھلے پچاس سال سے ادبی میدان میں کام کر رہے ہیں ہم نے برہان پور کی جنتا لائبریری بھی ایک ساتھ رہ کر چلائی ہے۔ اور ادبی نشستیں بھی ایک ساتھ کی ہیں۔

انھوں نے ایک لٹریری فورم بھی بنایا ہے جس کی سرپرستی مجھ ناچیز کو سونپی ہے۔ جب ایک دِن میں نے ان سے کہا کہ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ "خزانۂ رحمت" کے آخری صفحات استاد مرحوم اپنے ساتھ کراچی لے گئے تھے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو ان کے کچھ کاغذات اور مسودات ملے ہیں تو کیا ان میں "خزانۂ رحمت کے آخری صفحات بھی ہیں؟

اس کے جواب میں جاؔبر صاحب نے مجھ سے کہا کہ استاد راشؔد مرحوم کے بھتیجے حبیب اللہ مرحوم نے وہ کاغذات و مسودات مجھے بھیجے تھے وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔ کیوں کہ ہماری میٹنگ میں یہ طے ہوا تھا کہ یہ کاغذات میرے پاس ہی رکھے جائیں۔

یہ ۱۹۸۸ء کی بات ہے۔ اس وقت سے یہ کاغذات میرے ہی پاس ہیں۔ مگر ان میں "خزانۂ رحمت" کے وہ آخری صفحات نہیں ہیں جن کے بارے میں آپ نے مجھ سے پوچھا ہے۔ میرے پاس ان کاغذات و مسودات کی فہرست ہے وہ سب آپ کو دے دوں گا۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ ان میں وہ صفحات نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان میں استادِ محترم کا تحریر کردہ "تاریخِ برہان پور" کا وہ مسودہ ہے جس کے بارے میں لوگ مجھ سے دریافت کرتے ہیں۔ کہ وہ میرے پاس ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ استادِ محترم اپنا لکھا ہوا "تاریخِ برہان پور" کا مسودہ برہان پور کے اپنے

شاگردوں کے حوالے کر دینا چاہتے تھے اور اِس سلسلے میں انھوں نے مجھے خط لکھا تھا۔ مگر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ محترم مجھے وہ مسودہ نہ بھیج سکے۔ ان کی. فات کے بعد مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ استادِ محترم نے اپنی حیات ہی میں اپنا وہ مسودہ ڈاکٹر شیخ فرید کو بھیج دیا ہے۔ مجھے یہ بات حبیب اللہ مرحوم کے اس خط سے معلوم ہوئی تھی جو انھوں نے مجھے لکھا تھا۔ اس کی تصدیق کے لئے میں اپنے تین ساتھیوں وصال الدین احمد' اقبال احمد اور تقی صاحِب کے ساتھ ڈاکٹر شیخ فرید صاحِب کے گھر گیا اور انھیں محترم جناب حبیب اللہ کا خط دکھایا اور درخواست کی کہ ہمارا ایک ادبی ادارہ ہے اور ہم اس ادارے کے تحت "تاریخِ برہان پور" کو شائع کرنا چاہتے ہیں جس کا مسودہ استادِ محترم نے آپ کو بھیجا ہے وہ ہمیں دے دیجئے تاکہ ہم اسے جلد سے جلد شائع کرنے کی کوشش کریں۔ مگر ڈاکٹر صاحِب نے لاعلمی کا اظہار کرتے رہے یہ کہا کہ مجھے وہ مسودہ نہیں ملا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مخدوم جابرؔ صاحِب نے استاد راشدؔ مرحوم کی خود کی لکھی کتابوں کی وہ فہرست بھی دیکھنے کو دی جو استادِ محترم راشدؔ مرحوم کے پاس اس وقت کراچی میں تھی۔ وہ بیش قیمت ادبی ذخیرہ اب کہاں ہے؟ میں نے ان سے جب سوال کیا تو جابرؔ صاحِب نے فرمایا کہ انھیں نہیں معلوم کہ یہ ادبی ذخیرہ استادِ محترم نے کس ادبی ادرہ کو محفوظ رکھنے کے لئے دے دیا ہے؟ یا پھر ان کے وارثوں کے پاس محفوظ ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اگر یہ بات صحیح ہے جس کا مجھے پورا یقین ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "خزانۂ رحمت" کے آخری صفحات کی تلاش میں ہم وہیں کے وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ مگر اس میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہمیں نئے سرے سے ان صفحات کی کی تلاش جاری رکھنی چاہئے۔

اس کے ساتھ ہمیں اپنے شہر کے ایک مایہ ناز شاعر و ادیب علامہ مطیع اللہ راشدؔ مرحوم کے "تاریخِ برہان پور" کی بھی کھوج کرنی چاہئے کہ وہ کس کے پاس ہے؟ کیوں کہ یہ مسودہ بھی برہان پور کا ایک ادبی سرمایہ اور ورثہ ہے جس کو تلاش کرنا ہماری ادبی ذمہ داری ہے۔

برہان پور کے دو روحانی بزرگوں کی ملاقات

[ایک سوال]

کیا دارالسرور برہان پور کے دو روحانی بزرگ اور ولیٔ کامل حضرت بہاؤالدین باجنؒ اور حضرت شاہ نظام الدین عرف شاہ بھکاریؒ میں ان کی حیاتی میں بالمشافہ گفتگو ہوئی تھی؟ روحانیت میں دلچسپی رکھنے والے ایک صاحب کا سوال ہے۔ جو خاصا دلچسپ ہے۔ اس کا بلا سوچے سمجھے صرف ہاں یا نہیں میں جواب دینا تو آسان ہے لیکن تاریخی شواہدات کی روشنی میں تفصیلی طور پر جواب دینا ذرا مشکل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دارالسرور برہان پور کی تاریخی عظمت و قدامت ہی مشہورِ زمانہ نہیں بلکہ اس کی یہ خوبی بھی کافی شہرت رکھتی ہے کہ یہ شہر جس کے بارے میں غلام علی آزاد بلگرامی کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

زہے مقامِ مقدّس کہ اولیا خیز است
کند سپہر طواف فضائے برہان پور

برہان پور بڑا اولیا خیز ہے یہاں کہ سرزمین میں ایسے ایسے روحانی بزرگ اور ولیٔ کامل محوِ خواب ہیں جن کی فضیلت اور بزرگی ایک دنیا قائل ہی نہیں بلکہ کہنا چاہئے ان کی معتقد بھی ہے۔ ان بزرگانِ دین نے اپنی زندگیاں طالبانِ حق کو باطنی فیض پہنچانے نیز تشنگانِ علم وادب کو تمام علوم مروّجہ میں کامل بنانے میں گزار دی۔ ان اولیائے کرام میں دو ولیٔ کامل ایسے سرِ فہرست ہیں جن کا ایک زمانہ معتقد ہے۔ یہ عابدِ زمانہ اور زاہدِ وقت ہیں۔ قریب پانچ سو سال سے ان کی درگاہیں زیارت گاہِ خلائق ہیں اور ان کے فیض سے آج بھی پورا شہر منور ہو رہا ہے۔ یہ دونوں روحانی بزرگ اور ولیٔ کامل ہیں:

[۱] حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ اور [۲] حضرت شاہ نظام الدین عرف شاہ بھکاریؒ۔

یہ دونوں ہی روحانی بزرگ ولایت اور قطبیت کے اعلیٰ فضائل رکھتے ہیں۔ شہر کے اولیائے کرام میں ان کا مرتبہ بھی اعلیٰ و افضل ہے۔ دونوں کا درجہ کمال بھی سب سے بلند ہے۔ اور دونوں ہی بزرگ صاحبِ کشف و کرامات اور علم و فضل سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ دونوں کا شمار ملک کے مشہور و معروف اولیاء کرام میں ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ برہان پور کے ان دو عظیم روحانی بزرگوں کبھی بالمشافہ گفتگو ہوئی تھی؟ اس کا جواب تاریخی روشنی میں ہمیں دینا ہے۔

بالمشافہ گفتگو کے معنی ہیں آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنا۔اس کے لئے ضروری ہے کہ بات کرنے والے ایک جگہ ایک وقت میں روبرو ہو کر باتیں کریں۔اس معنی کی روشنی میں مذکورہ سوال کا جواب ہمیں تلاش کرنا ہے کہ کیا شاہ باجنؒ اور شاہ بھکاریؒ میں کبھی بالمشافہ گفتگو ہوئی تھی؟اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت شاہ باجنؒ اور حضرت شاہ بھکاریؒ ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ روبرو ہوئے تھے۔اور ان میں گفتگو ہوئی تھی۔اسے ثابت کرنے کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ حضرت شاہ باجنؒ اور حضرت شاہ بھکاریؒ ایک ہی وقت یا زمانہ میں برہان پور میں موجود تھے۔

ان دونوں ولیٔ کامل میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور وہ یہ کہ دونوں ہی بزرگ ایک ہی زمانے میں ایک ہی فاروقی بادشاہ عینا عادل شاہ کے عہدِ حکومت میں ہوئے۔دونوں کی ہی ولادت برہان پور میں نہیں ہوئی۔ لیکن انھوں نے اپنے آبائی وطن سے برہان پور آکر مستقل سکونت اختیار کی۔اور اس شہر کو اپنا وطنِ ثانی بنایا۔ عبادت 'ریاضت' رشد و ہدایت اور درس و تدریس میں یہاں اپنی زندگیاں گزاریں۔اور یہیں آپ کا وصال پانچ سال کے وقفے سے ہوا۔دونوں ہی کے مزار پر سنگین مقبرے بنے ہوئے ہیں۔اور دونوں ہی کی درگاہیں زیارت گاہِ خاص و عام بنی ہوئی ہیں۔ آپ دونوں کا سلسلہ و طریقہ بھی ایک جیسا یعنی چشتیہ تھا۔اور ایک دلچپ بات یہ آپ دونوں ہی کے لقب کا پہلا حرف ب ہے۔اور جہاں آپ آرام کی نیند سو رہے ہیں اس شہر کا پہلا حرف بھی ب ہے۔جو بڑا برکتوں والا ہے۔

اور آخر میں ایک بار اور مشترک ہے۔اور وہ یہ کہ ان دونوں ہی روحانی بزرگوں کے بارے میں کوئی وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں ولیٔ کامل کب برہان پور تشریف لائے تھے؟

اس لئے سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہو گا کہ حضرت شاہ باجنؒ برہان پور کب تشریف لائے تھے؟اور حضرت شاہ بھکاری برہان پور کب آئے تھے؟آپ میں سے ایک قدوۃ السالکین حضرت شاہ بہاؤ الدین باجنؒ قدس سرہ' شہر احمد آباد[گجرات] میں ۹۰۷ ہجری حجاز مکہ معظمہ سے ہندوستان آئے ہوئے۔آپ کی ولادت حضرت معز الدین ابنِ عبد الملک کے ہاں

ہوئی۔ آپ اپنے زمانے کے مشہور بزرگ حضرت عزیز اللہ متوکل مانڈوی [متوفی ۸۵۱ھ مانڈوی] کے صاحب زادے حضرت مخدوم رحمت اللہ سے مرید ہوئے۔ اور ان کی خدمت میں اکیس برس رہ کر تمام علومِ مروجہ میں دست رس حاصل کی۔ اور اپنے پیر سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ پھر آپ نے سیر و سیاحت شروع کی۔ خراسان سے جب آپ حج کا ارادہ کر کے روانہ ہوئے تو دورانِ سفر آپ کو بشارت ہوئی کہ آپ کے پیر کا وصال ہو گیا ہے۔ اور اپنے وطن کی طرف مراجعت کریں۔ آپ ارادۂ حج ملتوی کر کے وطن لوٹ آئے۔

اپنے پیر حضرت رحمت اللہ کے مزار سے آپ کو باجنؒ کا لقب ملا۔ پھر آپ حضرت برہان الدین غریبؒ کے روضہ کی زیارت کے لئے خلد آباد گئے۔ یہاں سے آپ بیدر پہنچے اور شیخ منجھلے منصورِ زماں مسعود بیک کے خلیفہ سے خرقہ مسعودی حاصل کیا۔ بعد ازاں آپ پہلے خانہ پور اور پھر برہان پور تشریف لائے۔ اور یہیں زندگی کے باقی دِن رشد و ہدایت اور درس و تدریس میں گزار کر ۹۱۲ ہجری میں واصلِ رحمتِ الٰہی ہوئے۔ دوسرے ولیٔ کامل زبدۃ العارفین حضرت شاہ نظام الدین عرف شاہ بھکاری کے حالاتِ زندگی ہمارے علماء اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ آپؒ کی ولادت اجودھن کے پاک پٹن [ضلع منٹگمری، پاکستان] میں ۸۳۷ھ میں حضرت شیخ یوسف جوسی کے ہاں ہوئی۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر [۵۸۴۔۶۶۴ھ] سے سات واسطوں تک ہے۔ آپ نے اپنے والدِ بزرگوار سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اور انھیں کی اجازت سے حجِ بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اس درمیان آپ کے والدِ بزرگوار حضرت یوسف جوسی پاک پٹن سے مع اہل و عیال اسیر گڑھ آگئے۔ اور یہیں آپ کے والد کا وصال ہو گیا۔ مزار آپ کا اسیر گڑھ میں ہے۔ پانچ حج پورے کرنے کے بعد حضرت شاہ بھکاری برہان پور تشریف لائے۔ اور اللہ نور بڑی [موضع سکھپوری] موجودہ نام حضرت شاہ' میں مستقل سکونت اختیار کی۔ پھر آپ نے مانڈو پہنچ کر حضرت شمس الدین قدس سرہ' سے بعیت کی۔ اور شاہ بھکاری کا لقب پایا۔ تین مرتبہ دکن کی سیر کرنے کے بعد آپ نے برہان پور کے اللہ نور بڑی [حضرت شاہ] میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اور رشد و ہدایت اور درس و تدریس کا اپنا فرض ادا کرنے کے بعد آپ کا انتقال بارہ ربیع الاول ۹۰۷ھ مطابق

۱۵۰۳ءعیسوی میں ہوا۔

ان دونوں ہی بزرگوں کے تعلق سے یہ سوال بے حد پیچیدہ ہے جو کئی سوالوں سے جڑ کر اور زیادہ الجھ گیا ہے۔ اس لئے اسے حل کرنے کے لئے ہمیں انھیں بزرگوں کے حالاتِ زندگی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

اس سلسلے میں برہان پور کے معزز محققین جناب مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم، جناب جاوید صاحب انصاری مرحوم، جناب بشیر محمد خان صاحب ایڈوکیٹ مرحوم اور جناب مولوی معین الدین صاحب ندوی مرحوم نے اپنی گراں قدر تصانیف میں جو کچھ حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ سے متعلق تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت شاہ باجنؒ احمد آباد سے روانہ ہو کر پہلے خانہ پور آئے، جو کہ برہان پور سے جانب جنوب سات میل کی دوری پر ہے۔ اور بادشاہِ وقت کی درخواست پر آپ برہان پور تشریف لائے۔ آپ کے لئے ایک مسجد اور خانقاہ تعمیر کی گئی۔ اور "وہ برہان پور جو حضرت برہان الدین غریبؒ کے زیرِ سایہ تھا وہ آپ کے زیرِ سایہ آگیا۔"

کتاب "سخنورانِ گجرات" کے مصنف جناب ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم نے اس سلسلے میں شاہ باجنؒ کی مسجد میں لگے ہوئے کتبے کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ شاہ باجنؒ نے اپنی عمر عزیز کے چالیس سال برہان پور میں گزارے۔[۴۸]

تقریباً یہی بات ڈاکٹر شیخ فرید صاحب بھی اپنی کتاب "شاہ بہاؤالدین باجنؒ" میں کہتے ہیں۔ کہ اگر تعمیر مسجد کا سن بنیاد ۸۷۷ ہجری سے چار پانچ سال پہلے شاہ باجنؒ کے برہان پور اقامت گزینی کو شمار کریں تو چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب موصوف شیخ فرید صاحب بھی اپنی کتاب "شاہ بہاؤالدین باجنؒ" میں کہتے ہیں کہ "اگر تعمیر مسجد کا سنِ بنیاد ۸۷۷ ہجری سے چار پانچ سال پہلے شاہ باجنؒ کے برہان پور اقامت گزینی کو شمار کریں تو چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب موصوف کی کتاب کے مقدمہ نگار ڈاکٹر ضیا الدین ڈیسائی نے چند اعتراضات کئے ہیں جن کے جواب میں راقم نے بھی ایک مضمون "برہان پور میں حضرت شاہ

باجنؒ کی آمد ایک سوال" لکھا ہے۔ جن میں تاریخی شواہد کی روشنی میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ قبلہ مدنی صاحب مرحوم نے جو چالیس سال والی بات لکھی ہے وہ صحیح اور درست ہے۔ حضرت شاہ باجنؒ ۸۷۲ھ کے لگ بھگ برہان پور تشریف لائے تھے۔ یہ بات تاریخی شواہد کی روشنی میں ثابت ہوتی ہے۔

اب رہ جاتی ہے یہ بات کہ حضرت شاہ نظام الدین عرف شاہ بھکاریؒ برہان پور کب تشریف لائے تھے؟ تو اس سلسلے میں بھی ہمیں اپنے قابلِ احترام محققین کی گراں قدر تصانیف سے استفادہ کرنا ہوگا۔ ان محققین کے اسمائے گرامی میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ ان کے علاوہ برہان پور کے اور بھی عالموں کی گراں قدر کتابوں کو بھی ہمیں نظر میں رکھنا ہوگا۔۔۔ یہ دو عالم ہیں:

[۱] جناب مولوی فخر الدین صاحب مرحوم اور [۲] علامہ سیّد مطیع اللہ صاحب راشدؔ مرحوم

یہ حضرت شاہ بھکاریؒ کے وہ تذکرے ہیں جو آپ کے ملفوظات کے پیشِ نظر لکھے گئے ہیں۔

حضرت شاہ بھکاریؒ کے ملفوظات فارسی زبان میں ہیں۔ جو آپ ہی کے خلیفۂ خاص شاہ حمید الدین کے تحریر کردہ ہیں۔ ان کے بارے میں جناب بشیر محمد خان صاحب ایڈوکیٹ مرحوم نے اپنی تصنیف "تاریخِ اولیائے کرام برہان پور" میں لکھا ہے کہ "یہ قلمی ملفوظات برہان پور کی شاہی جامع مسجد کے خطیب و امام حضرت سیّد مولوی احکام اللہ صاحب بخاری مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں۔" [۶۲]

مولوی فخر الدین مرحوم نے ۱۳۴۲ھ میں مذکورہ ملفوظات کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا جو اب نایاب ہے۔ اسی طرح علامہ سیّد مطیع اللہ راشدؔ مرحوم نے "تذکرہ شاہ بھکاریؒ تالیف کر کے شائع کیا تھا۔ جو اب مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ جاوید انصاری صاحب مرحوم نے بھی شاہ بھکاریؒ کے حالاتِ زندگی پر ایک تذکرہ "فیض روحانی" کے عنوان سے لکھ کر شائع کیا ہے۔ جو سردار پریس مالیگاؤں میں ۱۹۸۰ء میں چھپا تھا۔ ایسے کُل تین تذکرے ہیں۔

مذکورہ تذکروں میں ان قابلِ احترام محققین نے حضرت شاہ بھکاریؒ کے برہان پور آنے کے سلسلے

میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت شاہ بھکاریؒ پانچ حج کرنے کے بعد ہندوستان آئے اور پھر سیر و تفریح کرتے ہوئے برہان پور آکر اللہ نور برڑی [موضع سکھپوری موجودہ نام حضرت شاہ] میں قیام پزیر ہوئے۔

ان تذکروں میں شاہ بھکاریؒ کے برہان پور تشریف لانے کا سن نہیں لکھا ہے۔ مگر حضرت موصوف کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ بغور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ بھکاریؒ حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ کے برہان پور تشریف لانے کے بعد یہاں تشریف لائے تھے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''ایک روز آپ کے [حضرت شاہ بھکاری کے] دل میں خیال گزرا کہ حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ سے جو پہلے سے برہان پور میں سکونت رکھتے ہیں' ملاقات کرنی چاہئے'' اور ''حضرت اور شاہ نے حجرے سے باہر آکر حضرت شاہ شہباز سے ملاقات کی۔ اور فرمایا'' اے دوست! فقیر اس شہر میں نو وارد ہے اور حضرت باجنؒ ایک عرصے سے یہاں مقیم ہیں اس لئے ملاقات کے لئے گیا تھا'' [تاریخ اولیائے کرام برہان پور ۱۰۹۔۱۰۸]۔

ان اقتباسات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شاہ بھکاریؒ جب برہان پور تشریف لائے تھے تو حضرت شاہ باجنؒ پہلے ہی سے یہاں مقیم تھے۔ اور یہ بات تقریباً طے ہے کہ حضرت شاہ باجنؒ ۸۷۲ھ کے لگ بھگ برہان پور تشریف لائے تھے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت شاہ بھکاریؒ نویں صدی کی آٹھویں دہائی میں برہان پور تشریف لائے تھے۔ اس کے ثبوت میں آپ ہی کے والدِ بزرگوار حضرت شاہ یوسف جوسی ابنِ شیخ محبط الدین [متوفی اسیر گڑھ ۸۷۰ھ] کے وہ الفاظ پیش کئے جاسکتے ہیں جو حضرت موصوف نے اس وقت کے والیٔ برہان پور عینا عادل شاہ فاروقی سے فرمائے تھے۔ ''میرا پیمانۂ عمر عنقریب لبریز ہونے والا ہے۔ اب تمہاری قسمت میرے فرزند نظام الدین سے وابستہ ہے۔ وہ تین فریضہ حج ادا کر چکا ہے۔ اور اس وقت ملک عرب کی سیاحت میں مشغول ہے۔ وہ دو حج ادا کرنے کے بعد برہان پور آئے گا۔ کیوں کہ یہاں کی ولایت اس کے سپرد کی گئی ہے۔ اس کے یہاں آنے پر اس کی خدمت میں رہ کر اپنی مرادیں

حاصل کرنا تمہاری مقصد براری ہو گی[کتاب ہذا ۱۰۱]
اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب شاہ بھکاریؒ پانچ حج کرنے کے بعد برہان پور تشریف لائے۔ تو عینا عادل شاہ والئ برہان پور آپ کی خدمتِ اقدس میں آکر قدم بوس ہوا۔"
عینا عادل فاروقی فاروقیہ سلطنت[حکومت خاندیس] کا چوتھا فاروقی سلطان تھا۔ جو اپنے باپ 'تیسرے فاروقی بادشاہ مبارک خان میراں عادل خان فاروقی کے انتقال کے بعد ۸۶۱ھ میں فاروقیہ سلطنت کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اسی "والئ برہان پور" کے عہدِ حکومت میں حضرت شاہ بھکاریؒ کا برہان پور تشریف لانا تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ۸۷۲ھ میں یا اس کے دو ایک سال بعد حضرت شاہ بھکاریؒ برہان پور آکر قیام پزیر ہوئے تھے۔
اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ جب شاہ بھکاریؒ برہان پور تشریف لائے تو آپ کے والدِ بزرگوار حضرت شاہ یوسف جوسی کا وصال اسیر گڑھ میں ۸۷۰ ھجری میں ہو گیا تھا۔ اس لئے تخت پر بیٹھا تھا۔
اسی سبب یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ۸۷۲ ھجری کے لگ بھگ شاہ بھکاریؒ برہان پور تشریف لائے تھے۔[اقتباس] "وہ[شاہ بھکاریؒ] دو حج ادا کرنے کے بعد برہان پور آئے گا۔"
اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ان دونوں روحانی بزرگوں میں کبھی بالمشافہ گفتگو ہوئی تھی؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے تعلق سے تاریخی کتابوں میں صرف دو واقعات[یا روایات] کا ذکر ہے۔ لیکن ان میں سے کسی بھی ایک واقعہ[یا روایت] سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت شاہ باجنؒ اور حضرت شاہ بھکاریؒ کے درمیان کبھی گفتگو ہوئی تھی۔ پہلا واقعہ تذکروں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "جب حضرت شاہ بھکاریؒ اللہ نور برزی میں مع احباب کے مقیم ہوئے تو حضرت شاہ باجنؒ نے ایک پیالہ پانی سے بھرا ہوا خادم کے ہاتھ حضرت شاہ کے پاس بھیجا۔ حضرت نے پانی میں ایک پھول ڈال کر اسی خادم کے ہاتھ پیالہ واپس کیا۔ اس رمز کا انکشاف اہلِ بصیرت نے یہ قرار دیا ہے کہ بھرے ہوئے پیالہ کا یہ اشارہ تھا کہ برہان پور اہلِ اللہ سے لبریز ہے۔ حضرت شاہ نے گویا یہ ظاہر کی کہ پانی میں مثلِ پھول کے میں اپنی جائے قرار رکھوں گا۔[کتب ہذا ۱۰۸]

دیگر تذکروں میں بھی یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جاوید انصاری صاحب مرحوم نے بھی اپنی تالیف ''فیض روحانی'' میں بعنوان ''رمز عارفانہ'' بیان کیا ہے۔ اور یہ لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ''ملفوظات میں تحریر ہے کہ جب شاہ بھکاریؒ برہان پور میں مقیم ہوئے یہاں کے بزرگانِ دین میں شیخ بہاؤالدین باجنؒ بہت مشہور تھے۔ آپ نے ایک پیالہ پانی سے بھرا ہوا خادم کے ہاتھ شاہ بھکاریؒ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت شاہ نے پانی کے اوپر ایک پھول ڈال کر اسی خادم کے ہاتھ واپس کر دیا۔ اس رمز کا مطلب اہلِ بصیرت نے یہ سمجھا کہ بھرے پیالے کا مطلب تھا شہر برہان پور اہلِ اللہ سے بھرا ہوا ہے۔ شاہ بھکاری نے اپنا جواب اس طرح دیا کہ جس طرح پانی پر یہ پھول ہے اسی طرح میں بھی اپنی جگہ قائم رکھوں گا۔ کسی پر بارِ خاطر نہ ہوگا۔ سبحان اللہ کتنی پاکیزہ مثال ہے۔'' [۱۴]

جاوید انصاری مرحوم نے ''ملفوظ میں تحریر ہے'' تو لکھا ہے مگر انھوں نے ملفوظات کا [ورق] صفحہ نمبر نہیں لکھا ہے۔ انھوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''ملفوظ میں تحریر ہے'' مطلب یہ کہ انھوں نے ملفوظات کو نہیں دیکھا ہے۔ یہ بات انھوں نے اپنے دیباچے میں بھی نہیں لکھی ہے کہ وہ شاہ باجنؒ کے ملفوظات کے مطالعے سے مشرف ہوئے ہیں۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ بات دیگر تذکروں میں دیکھ کر لکھی ہے۔

اس واقعہ کو قبلہ ایڈوکیٹ مرحوم نے اس تذکرے [اردو ترجمہ] کے حوالے سے لکھا ہے جو مولوی فخر الدین صاحب مرحوم [والدِ بزرگوار جناب وصال الدین مرحوم مدفون راستی پورہ قبرستان برہان پور] نے تالیف کیا ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ قبلہ ایڈوکیٹ مرحوم نے اس واقعہ یا روایت کو کسی عنوان [سرخی] کے تحت بیان نہیں کیا ہے۔ فٹ نوٹ میں اتاوَلی ندی سے متعلق روایتیں بیان کرتے ہوئے آپ نے مذکورہ روایت بیان کی ہے۔

مطلب یہ کہ صرف ایک روایت ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ورنہ ملفوظ میں اس کا ذکر ضرور کیا جاتا تھا۔

تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ یہی واقعہ حضرت شیخ عبد الرحیمؒ کرنچی کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ''تاریخِ برہان پور'' کے مئولف مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم نے ہو بہو بیان کیا ہے۔ جو ان روحانی بزرگوں کے بہت بعد کے روحانی بزرگ ہیں۔ [۱۶۴] اور ''تاریخ اولیائے کرام برہان پور'' [۳۱۷]

اس لئے ایسا خیال ہوتا ہے کہ ''تاریخ برہان پور'' میں اس واقعہ کو دیکھ کر بعد کے تذکرہ نگاروں نے اسے حضرت شاہ بھکاریؒ کے حالاتِ زندگی کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اس لئے ہمیں بھی اسے ایک روایت سے زیادہ وقعت نہیں دینی چاہئے۔ کیوں کہ یہ جانب داری کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اس روایت سے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت شاہ باجنؒ وسیع قلب و نظر کے مالک نہیں تھے۔ اور وہ شہر برہان پور میں کسی دوسرے روحانی بزرگ کی آمد کو ناپسند فرماتے تھے۔ جو حقیقت میں صحیح نہیں ہے۔ جس کا ثبوت آگے مضمون میں پیش کیا جائے گا۔

دوسرا واقعہ [یا روایت] بھی بشیر محمد خان صاحب ایڈوکیٹ مرحوم نے اپنی تصنیف ''تذکرہ اولیائے کرام برہان پور'' میں بعنوان ''شاہ باجن کا ملاقات کو جانا'' کے تحت بیان کیا ہے۔ جسے قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں پیش کر رہا ہوں:

''حضرتؒ کو برہان پور میں رہتے ایک مدت گزر گئی تھی۔ ایک دِن آپؒ کے دل میں خیال گزرا کہ حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ جو پہلے سے برہان پور میں سکونت رکھتے تھے' ملاقات کرنی چاہئے۔ اس لئے آپؒ شاہ حمید الدین' شیخ محمود' میراں سیّد پیارہ اور دیگر احباب کے ہمراہ حضرت شاہ باجنؒ کے مکان پر گئے اور خانقاہ میں ٹھہرے اور شاہ حمید الدین سے اطّلاع بھجوائی۔ حضرت شاہ باجنؒ کو اطّلاع ہوئی یا نہیں' مگر ان کے بڑے فرزند آئے اور حضرت شاہؒ سے بغل گیر ہوئے۔ فرزندِ شیخ باجن نے عنفوانِ شباب کے جوش میں حضرت کے جسم کو جو ریاضت و مجاہدے کے باعث نحیف و لاغر ہو گیا تھا بہ حالت معانقہ اٹھا لیا۔ جس سے آپؒ کے قدم زمین سے چار انگشت بلند ہو گئے۔ حضرت نے اس شخص کی نیت دیکھ کر قوتِ باطن سے ایسی پٹخنی دی کہ وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ آپ نے وہیں سے مراجعت کی اور اپنی خانقاہ کو لوٹ آئے۔ [۱۰۹-۱۰۸]

جب حضرت شاہ باجنؒ کو اپنے فرزند کی حالت کا علم ہوا' آکر دیکھا کہ ولایتِ باطن کو نقصان پہنچا ہے 'بہت مضطرب ہوئے اور شاہ شہبازؒ کی خدمت میں گئے اور سب کیفیت بتائی۔ شاہ شہبازؒ نے کہا' ایسا کرنا لازم نہیں تھا۔ اس پر حضرت شاہ باجنؒ نے بہت معذرت کی اور انھیں ان کی جانب سے عذر خواہی کی تکلیف دی" [۱۰۹۔۱۰۸]

اس واقعہ کو برہان پور کے دیگر تذکرہ نویسوں نے بھی بیان کیا ہے۔ لیکن مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم نے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ قبلہ ایڈوکیٹ مرحوم نے تفصیل کے ساتھ اس وقعہ کو بیان تو کیا ہے لیکن موصوف نے اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت بھی ایک روایت سے زیادہ نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ واقعہ بھی جانب داری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس غیر مستند روایت کو بیان کرنے کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہ باجنؒ کی روحانی طاقت پر شاہ بھکاریؒ کی روحانی طاقت کو بڑھتی ہوئی اجاگر کیا جائے۔

اس سے شاہ بھکاریؒ کی فضیلت کو ظاہر کرنے کا راوی کا مقصد تو پورا ہو جاتا ہے لیکن اس سے شہر برہان پور کے دو روحانی بزرگوں کے درمیان ناچاقی بھی ظاہر ہو جاتی ہے اس کو راوی نے نہیں سوچا ہے۔ اس روایت کو پڑھنے کے بعد دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس ناچاقی کی وجہ سے ان دو روحانی بزرگوں کے درمیان کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہوگی۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ان بزرگوں کے تذکرے میں ان دو روایتوں کو چھوڑ کر کوئی ایسا واقعہ بیان نہیں کیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان دونوں بزرگوں میں کبھی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ مگر بات ایسی نہیں۔ ان دونوں روحانی بزرگوں کے درمیان ملاقات بھی ہوئی تھی۔ اور ان میں بالمشافہ گفتگو بھی ہوئی تھی۔ ایک ذرا غور کرنے کی بات ہے۔

ان بزرگوں کے تذکروں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک بات ایسی نظر آتی ہے جس سے میری مذکورہ بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

"تاریخ برہان پور" کے مئولف مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم نے حضرت شاہ بھکاریؒ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

حضرت شاہ نعمانؒ نے فرمایا کہ "اب تم کو شہر میں رہنا ضروری ہے اور گوشہ نشینی مناسب ہے۔ لھذا حضرت شاہ بھکاریؒ نے حسبِ صلاح ورضا حضرت شاہ باجنؒ کے مکان اپنے واسطے اور خانقاہ درویشوں کے لئے بنوائی۔" [۱۲۴]

اس کا یہ مطلب ہے کہ حضرت شاہ باجنؒ اور حضرت شاہ بھکاریؒ میں نہ صرف یہ کہ بالمشافہ گفتگو ہوئی تھی بلکہ ان میں راہ ورسم بھی تھی۔ اور ان میں اکثر ملاقاتیں بھی ہوا کرتی تھیں جن میں دینی اور دنیاوی باتوں پر تبادلہ خیال بھی ہوا کرتا تھا۔

دنیا میں انسانوں میں صلاح و مشورہ تب ہوا کرتا ہے جب ان میں خلوص' ملنساری' پیار' محبت' دوستی اور بھائی چارہ بھی ہو۔ اور وہ ایک دوسرے کے جذبات وخیالات کا ادب ولحاظ رکھتے ہوں۔ اسی طرح روحانی بزرگوں میں بھی یہ سلسلہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ آپس میں پیار' محبت' دوستی اور بھائی چارہ رکھتے ہوں۔ اور ایک دوسرے کے تئیں ادب واحترام کا جذبہ رکھتے ہوں۔ حضرت شاہ باجنؒ اور حضرت شاہ بھکاریؒ میں یہ سلسلہ قائم تھا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ان میں اخلاص ومحبت' دوستی' تعظیم اور بھائی چارہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کا حد درجہ ادب اور لحاظ بھی کرتے تھے۔ دنیا' جہان کی باتوں پر ان میں گفتگو بھی ہوتی تھی۔ جب ہی تو حضرت شاہ بھکاریؒ نے حضرت شاہ باجنؒ سے اپنی رہائش اور درویشوں کی خانقاہ کے سلسلے میں صلاح مشورہ کیا تھا۔ اور انھیں کی صلاح ورضا سے اپنے لئے مکان اور درویشوں کے لئے خانقاہ بنائی تھی۔ اور یہ جگہ وہی ہے جہاں حضرت شاہ بھکاریؒ کی درگاہ واقع ہے۔

تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ جب ستر سال کی عمر میں بارہ ربیع الاول ۹۰۷ھ ۱۵۰۳ء بروز پنج شنبہ کو حضرت شاہ بھکاری کا وصال ہوا تو آپؒ کو اسی حجرے میں دفن کیا گیا جس میں آپؒ عبادت کیا کرتے تھے۔

مطلب یہ کے آج جہاں حضرت شاہ نظام الدینؒ عرف شاہ بھکاریؒ کا مدفن اور درگاہ ہے وہ جگہ حضرت شاہ بہاؤالدین باجنؒ قدسِ سرہ کی پسند کردہ ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ حضرت شاہ بھکاریؒ نے اپنے وصال سے پہلے

اپنے اولین جاں نشین شاہ حمید الدین کو خاص طور سے تاکید کی تھی کہ ان کی قبر پر پکا گنبد نہ بنوایا جائے۔ نہ کسی کو اسے بنوانے کی اجازت دی جائے۔ گنبد بنوانے کی نسل دنیا میں باقی نہ رہے گی۔ اس لئے کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ آپؒ کی قبر پر پکا گنبد بنوادیا جائے۔ لیکن جب دو غیر مسلم بھائیوں نے اپنا پورا اعتقاد اور حسنِ عقیدت کے پیشِ نظر اس کی اجازت شاہ حمید الدینؒ [متوفی ۹۲۱ھ حضرت شاہ برہان پور] سے چاہی تو آپ نے ان کے بے پناہ خلوص کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھیں گنبد بنانے کی اجازت مجبور ہو کر دے دی۔

بعد میں انھیں دونوں بھائیوں ابھنگ راؤ اور دلیپت راؤ نے اپنے مصارف سے شاہ بھکاریؒ کی قبر پر سنگین گنبد بنوایا۔ جس کی تعمیر میں شاہ حمید الدینؒ نے وہ اینٹ بطور سنگِ بنیاد کے رکھی تھی جو شاہ بھکاری نے زیارتِ حرمین کے وقت کعبہ شریف سے لائی تھی۔

تب سے یہ قومی ایکتا کی عظیم اور بے مثال یادگار قائم ہے۔

حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کا ہندی اور گوجری کلام

حضرت شاہ بہاؤ الدین باجن جتنے عظیم المرتبت روحانی بزرگ تھے۔ اتنے ہی عظیم عالم اور شاعر بھی تھے۔ آپ کا شمار قدیم ترین ریختہ گو شعراء اور گوجری زبان کے اوّلین شاعروں میں ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی کے ساتھ آپ کو ہندی اور گوجری زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ آج سے قریب چھ سو سال پہلے دکن اور گجرات میں جو زبان فارسی ہندی گوجری اور دیگر زبانوں کو ملا کر بولی جاتی تھی اس میں آپ نے پُر اثر شاعری کر کے ریختہ کو عروج بخشا ہے۔ اور ہندی اور فارسی کے فقروں کو ملا کر گنگا جمنی شاعری کو پروان چڑھایا ہے۔ اس لئے آپ کو نہ صرف یہ کہ قدیم ریختہ گو شعراء میں اعلیٰ مقام حاصل ہے بلکہ آپ کو گوجری زبان کے اوّلین شعراء میں بھی ایک اہم شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ آپ کی عمدہ اور بہترین شاعری پر ہمارے بہت سے علماء نے مقالات سپرد قلم کیے ہیں۔ اس سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، جمیل جالبی ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی، بشیر محمد خان ایڈوکیٹ اور ڈاکٹر شیخ فرید کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

بہترین اور فاضلانہ تصانیف "ولی گجراتی" اور "سخنوران گجرات" کے مصنف سیّد ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرحوم [سابق ایڈیٹر نوائے ادب بمبئی] نے اپنی کتاب "سخنواران گجرات" میں حضرت شاہ بہاء الدین باجن [۹۱۲ھ ۷۹۰ھ مطابق ۱۵۰۸ء ۱۳۸۸ء] کی پانچ نظمیں اور مختلف اشعار شاہ موصوف کے نمونۂ کلام کے طور پر درج کیے ہیں۔ اس نمونۂ کلام میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے وہ پہلی نظم درج کی ہے وہ یہ ہے:

یہ فتنی کے ملتی ہے
جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
ان چھل محبت چھلاتی ہے
ان رو کر بہت رولاتی ہے
ان چھو کر بھی گھاتے
ان محبت گھیرے پاڑے
اس بنگی ویر ان چھارے

ولے جی رہے اس تھی نیارے

ولے جائے نہ اس کے پارے

اس کارنہ تیز ترسنہ

چک ملے تو اس سنہ بلند

یہ جتنی انھوں پتاوے

چک پاس نہ بھوں آوے

جے اسم کدھی نہ پورنہ

جو ملے تو اس چھوڑنہ

جو دیکھتا اس تھیں بھاگے

یہ نچ انہ سنہ لاگے

دیکھ باجن یہ تو جھوتی

مکھ میتھی چت نیتھی

یہ ہے ایسی دھیتی

اس نظم میں گجری زبان کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کے معنی ڈاکٹر مدنی مرحوم نے لکھے ہیں۔ جنھیں میں قارئین کرام کی معلومات کے لئے لکھ رہا ہوں:

چھوکر = مل کر گھائے = زخمی کرے چارے = کرے جے = جو نیارے = الگ کارنہ = کارن تیں ہوں = کریں ترسنہ = ترسیں استعمال کریں = خوش ہوں تیارے = ترسائے

ناھوں نہ انھوں = نہ ان کے پاس اسم = اس کی طرف لورنہ لوریں = خواہش کریں کدھی = کبھی چھوڑنہ = چھوڑیں تھیں = سے نتھی = دھوکے باز کپتی دھتی = دھیت۔

واضح رہے کہ شاہ صاحب موصوف نے مذکورہ یہ نظم آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے برہان پور میں اس وقت لکھی تھی جب کہ ہندوستان میں ہماری دلکش اور ہر دل عزیز اردو زبان کا جنم بھی نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم ہوئی تھی۔ اس وقت برہان پور میں فاروقیہ سلطنت

کے پانچویں فاروقی بادشاہ عیسا عادل خان [۹۰۷ھ ۸۶۱ھ] کی حکومت تھی۔
دیکھیے اس نظم میں حضرت شاہ باجن نے کتنے سہل اور سلیس الفاظ میں دنیا کی خوبی [مکاری دھیٹ پن وغیرہ] پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ اس نظم کو چھ سو سال پہلے کے سہل ممتنع کی بہترین اور لاجواب مثال کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس نظم سے پہلے شاہ باجن نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

صفت دنیا ایں درویش بزبان ہندی گفت است

[مطلب جو خوبی دنیا کو اس درویش نے ہندی زبان میں کہا ہے۔]

اس زمانے میں شاہ باجن اپنی زبان کو گوجری یا ہندی کہتے تھے۔ جو بعد میں اردو زبان کہلائی۔
یہ نظم حضرت شاہ باجن کے مشہور قلمی ملفوظات [کتاب] خزانۂ رحمت کے ان قدیم نسخوں میں درج ہے جن کی تعداد دنیا میں صرف پانچ ہے۔ ان پانچ نسخوں میں سے تین نسخوں کے تعلق سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کا وجود ہے اور یہ فلاں جگہ محفوظ اور موجود ہیں۔ باقی کے دو نسخوں کے تعلق سے یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ یہ فلاں جگہ محفوظ و موجود ہیں۔ ہاں ان پانچوں نسخوں کے تعلق سے برہان پور کے مایہ ناز محقق اور ادیب شیخ فرید متوفی ۳ دسمبر ابن غلام محمد] نے برسوں کی تلاش و جستجو کے بعد بڑی مفید معلومات اپنی گراں قدر تصنیف "شاہ بہاء الدین باجنؒ" میں تحریر فرمائی ہیں۔ جو میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

خزانۂ رحمت حضرت شاہ بہاء الدین باجن کے قدیمی ملفوظات [قلمی] ہیں۔ یہ ایک مرید کا نذرانۂ عقیدت ہے۔ تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے زیادہ نسخے نہیں ہیں۔ راقم کو اس کے درج ذیل نسخوں کا علم ہے۔

۱۔ نسخۂ اوّل: مملوکہ مولوی احکام اللہ صاحب برہان پور

۲۔ نسخہ دوم: مملوکہ سیّد محمد مطیع اللہ صاحب راشدؔ [برہان پوری]

نصف آخر یا مکمل املا کی خصوصیات کے پیش نظر قدیم نسخہ ہے۔

نسخہ سوم: مملوکہ بشیر محمد خان وکیل مرحوم برہان پوری
انتہائی بد خط نسخہ ہے۔ آخر میں ترقیمہ نہیں ہے۔ کرم خوردہ
اور آب زدہ ہے۔ درمیان کے اکثر اوراق غائب ہیں۔ اور
ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ہیں۔ متن میں بھی خامیاں ہیں۔
نسخہ چہارم: نسخہ شیرانی۔ حافظ محمود شیرانی پہلے شخص ہیں جنھوں
نے شاہ باجن پر سب سے زیادہ لکھا ہے۔ ان کا نسخہ ''گلستانِ رحمت''
بارہویں صدی کا لکھا ہوا ہے جو سخت غلط ہے۔ اس کی اعلیٰ خصوصیات
نویں صدی ہجری کے نوشتہ ''بحر الفصاحت'' سے مماثل ہے۔
نسخہ پنجم: انجمن ترقیٔ اردو کراچی۔ یہ نسخہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو برہان
پور میں ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۱ء میں دستیاب ہوا، راقم [ڈاکٹر شیخ فرید] کے پیشِ نظر
اس کا زیروکس ہے۔ اصل مسودہ کرم خوردہ ہے۔ لکیریں اور نقطۂ قرأت
متن کی مشکلات میں اضافہ کرتے ہیں۔ ۱۲۵۶ھ کا نقل کردہ ہے۔

ترقیمہ عبارت سے معلوم ہوتا ہیکہ شاہ باجن خاندان کے ایک فرد
قدرت اللہ اسعد اللہ نے نقل کیا ہے۔ اس نسخہ کی املائی کیفیات
نویں صدی ہجری کے نصف اوّل کی ہیں۔ مثلاً گاف پر مرکز نہیں
ہے۔ یائے حروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق نہیں ہے۔
ہائے ہوز اور ہائے حطّی میں کوئی فرق نہیں ہے۔
حرف نفی نہ کو اکثر ملا کر لکھا گیا ہے۔
ڈڑ کے نشان ط کے لئے::: اس طرز میں بھی کوئی باقاعدگی نہیں ہے
الف بامد کے لئے دو الف ہیں۔
حروف مشدد کو دوبارہ لکھا گیا ہے۔

گمان غالب ہے کہ ''خزائن رحمت'' کا کوئی نسخہ خاندان میں محفوظ ہوگا پہلی نقل یا دوسری نقل

اشاعت ہو گی۔ اس کو محفوظ کرنے کے لئے قدرت اللہ نے زیر نظر نسخہ [پانچواں نسخہ۔۔ نسخہ پنجم] نقل کیا۔

اسعد اللہ [متوفی ۱۳۰۵ھ] کی وفات کے ساٹھ سال بعد یہ نسخہ نقل کیا گیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس نسخہ سے یہ نقل کیا گیا ہے وہ کس سن کا مکتوب تھا؟ کاتب کی ضعیف العمری ہاتھ میں رعشہ کی تکلیف کے اثرات متن سے ظاہر ہیں۔ بعض الفاظ کو جوں کا توں لکھ دیا گیا ہے۔

وہ عمر کی اس منزل میں تھے جہاں ہر بات کے جاننے کا اعادہ ہوتا ہے۔ اور جاننے کا تفاخر جاننے کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ اس پندار میں زیر نظر قول کیا گیا ہے۔ برہان پور کے نسخہ اوّل کے متن میں اور اس کے متن میں معمولی فرق ہے [۱۶۔۱۵]۔

"خزانۂ رحمت" کے پہلے مذکورہ نسخے کے تعلق سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ نسخہ جسے نسخہ برہان پور کہا اور لکھا جاتا ہے برہان پور کی شاہی مسجد کے موجودہ پیش امام اور خطیب مولوی سیّد اکرام اللہ صاحب بخاری [ابن ڈاکٹر حکیم مولوی شمس التوحید بخاری [متوفی ۱۹۷۸ء۔۱۳۹۸ھ مدفون مذکورہ مسجد] کے ذاتی کتب خانہ میں موجود و محفوظ ہے۔ اس کے تعلق سے ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی مرحوم نے بھی اپنی فاضلانہ تصنیف "سخنوران گجرات" میں لکھا ہے کہ مذکورہ تصنیف کا ایک نسخہ برہان پور میں مشائخ خاندان کے ایک شخص مولوی رفیع الدین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ میں نے راشدؔ صاحب کے توسط سے حاصل کرنے کی ہر چند کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ جب راشدؔ صاحب کو نسخہ دستیاب ہوا تو انھوں نے اس میں سے باجن کا ہندی کلام نقل کر کے پروفیسر ندوی صاحب کے پتے سے میرے پاس بھیجا۔ جس کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ ۱۹۷۱ء میں ندوی صاحب کے قلمی ذخیرے میں یہ پایا گیا۔ مولوی رفیع الدین کا نسخہ ان کی وفات کے بعد برہان پور کی جامع مسجد کے خطیب مرحوم حضرت احکام اللہ صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ کر دیا گیا جو اب احکام اللہ کے بھتیجے اور خطیب مسجد حضرت توحید میاں صاحب کی کشادہ دلی اور علم دوستی کی وجہ سے مجھے دیکھنے کو ملا۔ اس نسخہ کے پیش نظر ڈاکٹر شیخ فرید کا ایک مضمون "نوائے ادب" کے شمارہ اکتوبر

میں شائع کیا گیا۔ ''سخن ورانِ گجرات ''میں ''خزانۂ رحمت '' کے تعلق سے مذکورہ پر گراف پڑھنے کے بعد میں نے اپنے شہر برہان پور دارالسرور کے عظیم المرتبت شاعر اور روحانی بزرگ حضرت شاہ بہاء الدین باجنؔ کے حالاتِ زندگی اور دیگر حالات معلوم کرنے کی بیحد کوشش کی اس کے ساتھ ہی میں نے ''خزینۂ رحمت '' کے اس نسخہ کو بھی دیکھنے کی کوشش کی جو ہم سب کی خوش قسمتی سے ہمارے شہر برہان پور دارالسرور کے شاہی مسجد کے موجودہ پیش امام اور خطیب سیّد اکرام اللہ صاحب کے ذاتی کتب خانے میں موجود اور محفوظ ہے۔ مگر میری بد قسمتی سے چند در چند وجوہ کی بنا پر میں ''خزانۂ رحمت '' دیکھنے کا شرَف حاصل نہ کر سکا۔ اس کے باوجود میں ''خزانۂ رحمت '' کے بارے میں یہ معلومات حاصل کرنے میں لگا رہا کہ ''سخن ورانِ ''میں قبلہ ظہیر الدین مدنی صاحب نے ''خزانۂ رحمت '' کے تعلق سے جن مولوی رفیع الدین کا ذکر کیا ہے وہ کون ہیں ؟ان کے پاس ''خزانۂ رحمت '' کا نسخہ کہاں سے آیا؟ میری خوش قسمتی سے میری کوششیں بہت جلد بار آور ثابت ہوئیں۔اور مجھے مولوی رفیع الدین مرحوم اور ''خزانۂ رحمت '' کے تعلق سے بہت سی معلومات حاصل ہو گئیں۔اسی درمیان میں باوجود خواہش 'ارادے اور کوشش کے ''خزانۂ رحمت ''کو دیکھنے کا شرَف حاصل نہ کر سکا۔ پھر بھی میں نے تحقیق کر کے جو کچھ بھی معلومات حاصل کی تھیں ان کے پیشِ نظر ایک مضمون ''خزانۂ رحمت '' کے عنوان سے لکھا جسے میں نے ''ہماری زبان'' دہلی کے فاضل مدیر جناب ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے پاس بھیج دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ مضمون کو پسند فرما کر اسے ''ہماری زبان ''میں دو قسطوں میں شائع فرما دیا۔ پھر میں نے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے اصرار پر ایک اور مضمون ''خزانۂ رحمت '' کے بارے میں لکھا۔ یہ مضمون بھی میں نے ڈاکٹر صاحب کی بے پناہ عنایات کے پیشِ نظر آپ کے موقر جریدے ''ہماری زبان ''کو دہلی بھیج دیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے پھر مجھ پر عنایت کی نظر کی اور یہ مضمون بھی ہفت روزہ ''ہماری زبان ''کی دو قسطوں [شماروں] میں شائع ہو گیا۔ مذکورہ مضمون میں 'میں نے ''خزانۂ رحمت '' کے مذکورہ نسخہ دیکھے بغیر صرف اپنی معلومات کی بنا پر یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ کس طرح ''خزانۂ رحمت ''کا یہ مذکورہ نسخہ حضرت قبلہ مولوی احکام اللہ بخاری مرحوم کے ذاتی کتب خانے تک پہنچا ہے ؟

اس مضمون کے بعد میں نے ایک اور مضمون "خزانۂ رحمت" کے بارے میں [دوسرا حصہ] کے عنوان سے لکھا۔ جس میں میں نے اپنی معلومات کے پیشِ نظر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برہان پور کی درگاہ حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی میں بھی کسی زمانے میں "خزانۂ رحمت "کا ایک قلمی نسخہ موجود اور محفوظ تھا۔ پھر یہ نسخہ برہان پور کے ایک بزرگ ایڈوکیٹ اور سیاسی رہنما جناب سیّد احمد الدین مرحوم [مدفون دہلی والی مسجد محلہ نچد رکلاں برہان پور] کے توسط سے ... کس طرح مذکورہ شاہی جامعہ مسجد کے موجودہ پیش امام اور خطیب کے ذاتی کتب خانے میں پہنچ گیا۔

"خزانۂ رحمت" کے تعلق سے تیسرا مضمون لکھنے کے بعد میں نے "خزانۂ رحمت" دیکھنے کی ایک مرتبہ اور کوشش کی۔ اور ایک دِن میں اپنے قریبی ساتھی محمد اظہر عرف بچّو میاں کے ساتھ مذکورہ امام صاحب کے دولت کدہ پر پہنچ گیا۔ ہم خوش قسمت تھے اس دِن پیش امام صاحب موصوف سے ملاقات ہو گئی۔ جب میں نے "خزانۂ رحمت" دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو صاحبِ موصوف نے اسے بخوشی قبول فرمایا۔ کچھ لمحوں کی بات چیت کے بعد پیش امام صاحب موصوف نے الماری کھول کر دو کتابیں میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے جب ان کی بے پناہ عنایت اور فراغ دلی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان دو مجلد کتابوں کو دیکھا تو مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی اور مسرّت ہوئی کہ یہ وہی "خزانۂ رحمت" دو بیش بہا نسخے ہیں جن کے بارے میں میں نے مضمون لکھے ہیں۔

ان دونوں کتابوں کی جلدیں ایک جیسی ہیں پہلی نظر میں انھیں دیکھنے پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ "خزانۂ رحمت" دو حصّوں میں ہے۔ مگر غور سے دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ "خزانۂ رحمت" کی ایک جیسی جلدیں ہیں عبارت اور صفحات بھی قریب قریب یکساں اور برابر ہیں صفحات کی تعداد ۶۷۴ ہے۔ "خزانۂ رحمت" کے مذکورہ دو یکساں نسخوں میں سے ایک نسخہ وہ ہے جو مولوی رفیع الدین مرحوم نے آج سے تقریباً پچاس سال پہلے [اندازاً ۱۹۵۴ء] محفوظ

رکھنے کے خیال سے مذکورہ شاہی مسجد برہان پور کے موجودہ پیش امام اور خطیب الحاج مولوی سیّد اکرام اللہ بخاری صاحِب کے والدِ بزرگوار حضرت ڈاکٹر حکیم مولوی سیّد شمس التوحید مرحوم [متوفی] سگے بھتیجے اور داماد حضرت مولوی سیّد احکام اللہ بخاری مرحوم کو دیا تھا۔اس لئے میں اپنے اس مضمون میں مذکورہ نسخے کو ''مولوی محمد رفیع والا نسخہ ''لکھنا مناسب سمجھ رہا ہوں۔

اس لئے کہ متعلق مضمون میں کہی گئی باتوں کو سمجھنے یں آسانی اور سہولیات ہوں گی۔

اس مذکورہ مولوی محمد رفیع الدین والے نسخے کے تعلّق سے درج ذیل باتیں میری تلاش و جستجو کے مطابق قریب قریب طے شدہ ہیں۔

[۱] اپنے ملفوظات ''خزانۂ رحمت اللہ'' یا ''خزانۂ رحمت '' کو عظیم المرتبت روحانی بزرگ اور اردو کی قدیمی شاخ گوجری کے قدیم ترین عالم و فاضل اور اوّلین شاعر قدوۃ السالکین و زبدۃ العارفین حضرت شیخ بہاؤالدین بٰاجن قدس سرہ' [۷۹۰ھ ۱۳۸۹ تا ۹۱۲ھ ۱۵۰۸ء] نے برہان پور دارلسرور کے دوران قیام [۸۷۲ھ ۱۴۵۹ء تا ۹۱۲ھ ۱۵۰۸ء قریب چالیس سال] میں تحریر فرمائے ہیں۔

[۲] آپ [شاہ باجن] کے واصلِ حق ہو جانے تک یہ قلمی ملفوظات آپ کی کتابوں کے ذخیرے میں محفوظ رہے۔

[۳] آپ [شاہ باجن] کے وصال کے بعد آپ کے پانچ فرزندوں [حضرت شاہ عبد الحکیم 'شاہ بہلول' مستان شاہ اور محمد ٹکّھی] کی تحویل میں رہا

[۴] اس درمیان میں [یعنی ۹۱۲ھ سے ۱۲۵۶ھ تک] اس مذکورہ قلمی ملفوظات ''خزانۂ رحمت'' کی اور نقلیں [نسخے] تیار کیے گئے۔

[۵] اس قلمی ملفوظات ''خزینۂ رحمت'' کی آخری نقل حضرت شاہ باجن کی اولاد میں سے ایک فرد قدرت اللہ بن شاہ اسد اللہ نے ۱۲۵۶ھ میں کی ہے جسے کراچی یونیورسٹی میں بابائے اردو حضرت مولوی مولوی عبد الحق صاحِب نے کئی برسوں تک اپنے مطالعہ میں رکھنے کے بعد محفوظ رکھنے کے خیال سے دے دیا ہے۔

[۶] ''خزانۂ رحمت ''کا مذکورہ نسخہ رفیع الدین [مملوکہ مولوی اکرم اللہ] ۱۲۵۶ھ کے بعد نا معلوم

ذرائع سے کی اس مدرسہ مسجد [بدھوارہ] کے کتب خانے میں پہنچ گیا۔ جس میں برہان پور کے مرہٹوں کی عملداری کے دور [۱۱۷۳ھ تا ۱۲۷۸ھ] میں جید عالم حضرت شاہ غلام محمد طالبانِ علم و عرفان کو درس دیا کرتے تھے۔

[۷] بعد ازاں مذکورہ شاہ غلام محمد کی وفات کے بعد مذکورہ نسخہ دوسرے عالم حضرت محمد اسمٰعیل عباسی [شاگرد مشہور عالم فاضل اور اہلِ اللہ کامل حضرت قاضی محمد حیات صاحبِ المخاطب قاضی شریعت خان [مدفون قریب گنبد حضرت شاہ نظام الدین 'عرف شاہ بھکاری] کی تحویل میں رہا۔ جو مذکورہ قدیمی مدرسہ مسجد کی درس گاہ میں درس دیا کرتے تھے اور جو بقول صاحبِ "تاریخِ برہان پور" اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ کتبِ نایاب ان کے پاس تھیں۔ برہان پور میں کوئی عالم ان کے برابر اس وقت نہ تھا۔ [۲۱۸]

[۸] آپ [محمد اسمٰعیل عباسی] کے واصلِ حق ہو جانے کے بعد یہ ملفوظات [خزانۂ رحمت] آپ کے برادرِ خورد اور حکیم لاثانی حضرت مولوی محمد اسحاق [پیش امام و خطیب مسجد واقع چوک برہان پور] کے ذاتی کتب خانے میں پہنچ گیا۔

آپ برہان پور کے عظیم المرتبت قاضی خاندان کے بزرگ مولوی فضل الرحمان اور قاضی سعد الرحمان کے ماموں تھے۔ مذکورہ مسجد برہان پور کے انڈا بازار علاقے میں ہے۔

[۹] آپ [مولوی اسحاق] کی وفات کے بعد یہ قلمی ملفوظات "خزانۂ رحمت" آپ [محمد اسحاق] کے جانشین حضرت مولوی قدرت اللہ صاحب [متوفی ۱۲۳۸ھ مدفون صحنِ مذکورہ مسجد قریبِ حوض] کی تحویل میں رہا۔ آپ کے بارے میں کتاب "تاریخِ برہان پور" کے فاضل موءلف حضرت مولوی مولوی خلیل الرحمان مرحوم نے تحریر فرمایا ہے کہ "سوائے کتبِ نایاب مرحوم موصوف کے دوسرے ملکوں اور حرمین شریفین سے بھی اکثر کتابیں ان کو ہمدست ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مجلسِ وعظ میں عجیب تاثیر عطا فرمائی تھی۔ جو کوئی سنتا تھا ان کا مفتون ہو جاتا تھا۔ سلسلۂ قادریہ میں چشتیہ میں ہزارہا طالبان حق ان کے مرید ہوئے۔ [۲۱۹]

[۱۰] مذکورہ مولوی سید قدرت اللہ صاحب کے واصلِ حق ہو جانے کے بعد "خزانۂ رحمت" کا

مذکور نسخہ آپ [سیّد قدرت اللہ] کے جانشین اور قریبی رشتہ دار اور پیش امام مسجد چوک، مولوی سیّد سعادت میر مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ رہا۔

[۱۱] مذکورہ مولوی سیّد سعادت میر صاحب کی وفات کے بعد یہ قلمی ملفوظات کا نسخہ آپ [مولوی سیّد سعادت میر صاحب] کے دو فرزند مولوی فیض الدین مرحوم اور مولوی بشیر الدین مرحوم [ہدایت میر] کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ رہا۔

[۱۲] بعدازاں یہ قلمی ملفوظات مذکورہ مولوی بشیر الدین [ہدایت میر] کے اکلوتے فرزند مولوی محمد رفیع الدین مرحوم کی تحویل میں رہا۔ مذکورہ محمد رفیع الدین مرحوم اپنے والدِ بزرگوار کی طرح عالم و فاضل اور مشہور مولوی تھے۔ جو بہترین وعظ کیا کرتے تھے۔ اپنے دلکش انداز میں وعظ کہنے کی خوبی ان کی پہچان تھی۔ جو انھیں اس زمانے کے علماء میں ممتاز و مقبول بنائے ہوئے تھی۔ اور آج بھی برہان پور کے وہ بزرگ جنھوں نے آپ کو وعظ کہتے سنا تھا ان کے دلکش اندازِ بیاں کی دل کھول کر تعریف کرتے ہوئے آپ کو یاد کرتے ہیں۔

موصوف کی رہائش گاہ محلّہ چوک بازار [انڈا بازار] کے بزاز خانے والی گلی کے نکڑ پر تھی۔ یہیں آپ کا وہ ذاتی کتب خانہ تھا جس میں "خزانۂ رحمت" کا مذکورہ نسخہ موجود اور محفوظ تھا۔

[۱۳] آپ [مولوی محمد رفیع الدین] نے سخت علالت کے دوران اس قلمی ملفوظات ["خزانۂ رحمت"] کو محفوظ رکھنے کے خیال سے ۱۹۵۴ء کے آس پاس مذکورہ شاہی جامع مسجد کے اس وقت کے پیش امام اور خطیب حضرت مولوی سیّد احکام اللہ بخاری کے سگے بھتیجے اور داماد حضرت ڈاکٹر حکیم مولوی سیّد شمس التوحید صاحب کو دے دیا۔

[۱۴] مذکورہ بزرگوں کے واصلِ حق ہو جانے کے بعد یہ قلمی ملفوظات فی الحال مذکورہ حضرت الحاج سیّد اکرام اللہ صاحب بخاری کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ و موجود ہے۔

[۱۵] "خزانۂ رحمت" کے اس مذکورہ نسخہ [نسخۂ رفیع] پر "خزانۂ رحمت" اور "سیّد سعادت ... بن
سیاہی سے صاف طور سے لکھا ہوا ہے۔

اب آپ "خزانۂ رحمت" کے دوسرے یکساں نسخے کے تعلق سے کچھ خاص باتیں ملاحظہ فر

جو فی الحال مذکورہ کتب خانے میں موجود اور محفوظ ہیں۔ وہ خاص باتیں یہ ہیں:

[۱] حضرت بہاؤالدین باجن کے ایک پسر زادے شیخ فرید تھے جو حضرتِ موصوف شاہ باجن کے فرزندِ ارجمند حضرت شیخ عبدالحکیم کے فرزند تھے۔ آپ [شیخ فرید] بھی اپنے دادا بزرگوار کی طرح عالم فاضل، شاعر اور صاحبِ تصنیف تھے۔ آپ نے اپنی تصنیف میں اُس زمانے کی عربی و فارسی کی مشکل کتابوں کا انتخاب و اختصار اتنے عمدہ اور دلکش انداز میں کیا ہے کہ پیچیدہ مسائل کے معنی و مطالب آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ آپ کے پاس عمدہ اور بہترین کتابوں کا ذخیرہ تھا اسی میں آپ کے دادا بزرگوار حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کے ملفوظات ''خزانۂ رحمت'' کا بھی ایک نسخہ تھا یہ نسخہ پہلے آپ [شیخ فرید کے والدِ بزرگوار شاہ عبدالحکیم [متوفی ۹۶۲ھ مزار احاطہ درگاہ شاہ باجن برہان پور پیر و مرشد حضرت شیخ علی متقی مصنف کتاب ''کنز العمال'' اور دیگر سو کتابیں متوفی ۹۷۵ھ کی کتابوں کے ذخیرے میں تھا۔ حضرت شیخ فرید فارسی میں بھی شعر کہتے تھے آپ کا ذکر عاقل خان رازی نے اپنی تصنیف ''ثمرات الحیات'' [قلمی] میں، جو حسن محمد غوثی مانڈوی نے اپنی تصنیف ''گلزار لابرار'' میں کیا ہے۔ آپ برہان پور کے عظیم المرتبت روحانی بزرگ مسیح الاولیاء حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ [مصنف کتاب ''عین المعانی'' و دیگر، متوفی ۱۵ شوال ۱۰۹۳ھ درگاہ شریف برہان پور] کے مرید و خلیفہ تھے۔ انھی روحانی بزرگ مسیح الاولیاء شاہ عیسیٰ جند اللہ کے مرید اور جانشین حضرت شاہ برہان الدین رازِ الٰہی [متوفی ۱۰۸۳ھ درگاہ شریف برہان پور] سے مذکورہ شیخ فرید صاحب کی صاحب زادی کی شادی ہوئی تھی۔

[۳] حضرت شیخ فرید نے شادی کے بعد اپنا ذاتی مکان فیض خانہ مذکورہ روحانی بزرگ راز الٰہی کو دے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے [شیخ فرید نے] اپنے دادا بزرگوار شاہ باجن کے ملفوظات ''خزانۂ رحمت'' کا وہ نسخہ بھی دے دیا جو آپ کے پاس محفوظ تھا۔

[۴] حضرت شاہ برہان الدین رازِ الٰہی کی درگاہ برہان پور کے محلۂ چندر کلاں میں ایک بڑے احاطے میں واقع ہے۔ اس درگاہ میں اُس زمانے میں ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ اسی کتب خانے میں

خزانۂ رحمت "کا مذکورہ نسخہ ۱۰۵۰ھ سے ۱۳۴۰ [تقریباً تین سو سال تک] موجود اور محفوظ رہا۔ جس کا پتہ مذکورہ کتب خانہ کی قدیمی فہرست [تقریب پونے دو سو سال] سے چلتا ہے۔ اس فہرست میں جس کا زیروکس راقم کے پاس ہے۔ مذکورہ "خزانۂ رحمت" کا نام لکھا ہوا ہے اس مذکورہ قدیمی فہرست عنوان کے طور پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

"فہرست کتب ہا کہ در حجرۂ دیوان خانہ باغ اند شہر ربیع الثانی ۱۲۵۷ھ"

مطلب یہ کہ فہرست آج سے ۱۷۵ سال پہلے بنائی گئی تھی۔ اوپر میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "خزانۂ رحمت" کے نسخہ کراچی کو حضرت شاہ باجن کے خاندان کے ایک فرد قدرت اللہ بن شاہ اسد اللہ نے ۱۲۵۶ھ میں نقل کیا ہے اور یہ مذکورہ فہرست ۱۲۵۷ھ میں بنائی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ نسخہ کراچی کی نقل کے بعد یہ مذکورہ فہرست بنائی گئی ہے۔

مذکورہ فہرست کے صفحہ نمبر ۱۴۴ پر "خزانۂ رحمت" کا نام صاف طور پر لکھا ہوا ہے۔ یہ نام مذکورہ صفحہ کی چوتھی لائن میں لکھا ہے اس سے پہلے ["خزانۂ رحمت" سے پہلے] کتاب:

یک جلد لغات | یک جلد ذیوان | یک جلد مثنوی | یک جلد دیوان | یک جلد
مدار الافاضل | انوری' صائب | دفتر شوم | خواجہ حافظ | لغات ادویہ کے نام لکھے ہیں۔

پھر "خزانۂ رحمت" کا نام لکھا ہے۔ اس کے بعد بہت سے نام لکھے ہیں جن میں سے چند نام یہ ہیں:
یک جلد مثنوی شریف' شش دفتر' یک جلد شرح نصاب صیان' یک جلد معراج العارفین' یک جلد دیوانِ شمس ربریز' یک جلد دیوانِ ہاشم اور یک جلد کتاب الاخیار۔

[۴] قریب ساٹھ پینسٹھ سال کا عرصہ ہوا مذکورہ درگاہ شاہ برہان الدین رازِالٰہی کے اس وقت کے جانشین حضرت ریاض الدین مرحوم سے "خزانۂ رحمت" کے نسخے کو آپ کے ہم زلف جناب نواب سیّد احمد الدین ایڈوکیٹ مرحوم [خسر مذکورہ مولوی رفیع الدین مرحوم نسخہ محمد رفیع والے] مطالعے کے لئے لے گئے پھر وہ نسخہ درگاہ مذکور کو واپس نہیں کیا گیا۔ اور پھر بعد میں یہ مذکورہ نسخہ درگاہ والا نامعلوم ذرائع سے برہان پور کی شاہی جامع مسجد کے ذاتی کتب خانے میں پہنچ گیا۔

[۵] اسطرح جامع مسجد کے ذاتی کتب خانے میں "خزینۂ رحمت" کے دو یکساں نسخے محفوظ ہو گئے جن کا

ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔

یہ تو ہوئی ''خزانۂ رحمت'' کے مذکورہ نسخہ اوّل [مملوکہ احکام اللہ مرحوم] کی تفصیل۔ اب باقی کی ''خزانۂ رحمت'' کے چار نسخوں کی درج ذیل تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

ان مذکورہ چاروں نسخوں میں سے ایک نسخہ لاہور کی اورینٹل کالج میں وجود اور محفوظ ہے جسے نسخہ شیرانی کہا جاتا ہے۔ اس نسخے کے پیشِ نظر مایۂ ناز ادیب اور محقق پروفیسر حافظ محمود شیرانی مرحوم نے حضرت شاہ باجن کے کلام سے متعلق مقالات قلم بند کیے جو اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے۔

[۲] اس مذکورہ نسخۂ شیرانی کو ''گلستانِ رحمت'' بھی کہا جاتا ہے۔

[۳] یہ مذکورہ نسخہ شیرانی صاحب کو کب اور کیسے حاصل ہوا؟ اس سلسلے میں ہمارا ادب لاعلم ہے اور ہماری کتابیں خاموش ہیں۔ جس کا سخت دکھ اور افسوس ہے۔ اس کا کچھ بھی علم ہو جاتا تو اس سے بہت سی کڑیاں ملائی جاسکتی تھیں۔ امید کہ محققین حضرات اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

[۴] یہ نسخہ میرے خیال میں ماضی میں برہان پور ہی میں کسی کے پاس تھا جو نہ جانے کیسے پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب کو حاصل ہو گیا۔ پھر یہ آپ کے یا کسی اور صاحب کے ذریعے لاہور کی اورینٹل کالج کی زینت بن گیا۔ اگر اس بارے میں کچھ تلاش و جستجو کی جائے تو میرے خیال سے بہت سی مفید اور دلچسپ باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ جو آگے تحقیق کرنے والوں کے بہت کام آئیں گی۔

پانچواں نسخہ کراچی میں ہونے کی وجہ سے ''کراچی نسخہ'' کہلاتا ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ''خزانۂ رحمت'' کا یہ نسخہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو برہان پور ہی کے کسی صاحب سے دستیاب ہوا ہے۔ اس کی تحقیق سے بھی بہت سی مفید اور دلچسپ باتیں سامنے آنے کی امید ہے۔ یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کبھی برہان پور تشریف لائے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ماضی میں آپ جب اورنگ آباد [اور حیدر آباد] میں قیام پزیر تھے اس دوران میں آپ برہان پور دارالسرور تشریف لائے ہوں۔ یہ بات ۱۹۱۹ء یا پھر ۱۹۲۱ء کی

ہو سکتی ہے۔ خدا کرے یہ بات سچ ہو تا کہ اہلِ برہان پور فخر و ناز سے کہہ سکیں کہ بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق صاحب کسی زمانے میں برہان پور دار السرور تشریف لائے تھے۔

اب ''خزانۂ رحمت'' کے ان دو خطی نسخوں کے تعلق سے کچھ باتیں ملاحظہ فرمایئے جن کو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ''نسخۂ دوم''مملوکہ سیّد مطیع اللہ صاحب راشدؔ [برہان پوری] اور نسخۂ سوم مملوکہ بشیر محمد خان وکیل مرحوم [برہان پوری] لکھتے ہوئے کچھ تفصیلات لکھی ہیں' جو اوپر درج گئی ہیں:

[۱] ان دونوں نسخوں کے تعلق سے میں نے بہت زیادہ تلاش و جستجو کی۔ لیکن ان دونوں نسخوں کے تعلق سے کچھ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ان کا وجود ہے بھی یا نہیں ہے؟

[۲] علامہ سیّد محمد مطیع اللہ راشدؔ برہان پوری جب ۱۹۴۸ء میں برہان پور ہجرت کر کے کراچی چلے گئے تھے تو آپ اپنی سبھی قیمتی اور نادر الوجود کتابیں پہلے حیدر آباد [دکن] اور پھر وہاں سے کراچی لے گئے تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

[۳] اور یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے کہ راشدؔ صاحب نے اپنی تصنیف [''برہان پور کے سندھی اولیاء' ''تحفتہ المرسلہ'' اور دیگر] میں ''خزانۂ رحمت'' کے مذکورہ نسخے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ آپ نے اپنی تصنیف میں اپنی اس نادر الوجود اور بیش بہا کتابوں کا ذکر کیا ہے جو آپ کے ذاتی کتب خانے میں موجود اور محفوظ تھیں [یہاں میں نے ماضی کا صیغہ ''تھیں'' اس لئے استعمال کیا ہے کہ ان نادر لوجود اور بیش بہا کتابوں کا بھی کچھ پتہ' تلاش و جستجو کے بعد بھی نہیں چل سکا ہے۔] اس لئے اس بات کی صداقت میں شک پیدا ہوتا ہے کہ آپ [راشدؔ صاحب] کے پاس ''خزانۂ رحمت'' کا کوئی نسخہ تھا اگر آپ کے پاس کوئی نسخہ ''خزانۂ رحمت'' کا ہوتا تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اس بات کو پوشیدہ رکھنے میں کوئی مصلحت بظاہر نظر نہیں آتی۔ اس لئے جب تک کوئی تحقیق نہیں ہو جاتی یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا وجود ہے۔

[۴] اسی طرح ''خزانۂ رحمت'' کے نسخۂ سوم کے تعلق سے بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا وجود ہے۔ کیوں کہ تلاش و جستجو کے بعد بھی اس کے تعلق سے یہ معلوم نہیں ہو رہا ہے کہ یہ نسخہ ہے تو کہاں ہے اور کس کے پاس ہے؟

[۵] ''تاریخِ اولیائے برہان پور'' کے مؤلف جناب بشیر محمد خان ایڈوکیٹ ایک زمانہ ہوا واصل حق ہو چکے ہیں۔ آپ کی برہان پور کے عید گاہ قبرستان میں آخری آرام گاہ ہے۔ آپ کے ذاتی کتب خانہ کی نادر الوجود اور بیش بہا کتابوں کے تعلق سے بھی یہ بات کچھ حد تک افسوس کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ کہاں اور کس کے پاس ہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہو رہا ہے۔

[۶] اب یہ سوال ہے کہ ان نسخوں کے تعلق سے ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے اپنی گراں قدر کتاب ''شاہ بہاؤالدین باجن'' میں جو بھی تفصیلات لکھی ہیں وہ کہاں تک حقیقت پر مبنی ہیں؟ طریقہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ان کی موجودگی کے بارے میں کوئی ثبوت پیش کرتے مگر افسوس ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں یہ نہیں لکھا ہے کہ انھوں نے کب اور کہاں اور کس کے پاس دیکھا تھا؟ اگر ڈاکٹر صاحب نے انھیں دیکھنے کا شرَف حاصل کیا تھا تو اس کے تعلق سے یہ لکھنا چاہئے تھا کہ یہ نسخے کب اور کس کے پاس دیکھے تھے؟ ان نسخوں کے تعلق سے کچھ بھی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے آگے تحقیق کرنے میں بہت سی مشکلات پیش آرہی ہیں پھر بھی مجھے یقین ہے کہ اگر ان نسخوں کا کوئی وجود ہے تو پھر ان نسخوں کے تعلق سے کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہوگا بشرطیکہ ان کی تحقیق لگن اور محنت کے ساتھ کی جائے۔ ان کے تعلق سے تحقیق کے بعد جو بھی معلومات حاصل ہوں گی اس سے یقیناً ہمارے ادب اور ہماری زبان کو فائدہ ہی ہوگا ایسی امید ہے کیوں کہ ان میں سے ایک نسخہ ایسا ہے جو بقول ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم ''نصف آخر یا مکمل املا کی خصوصیات کے پیشِ نظر قدیم نسخہ ہے۔'' [۱۵]

اس لئے مجھ ناچیز کا یہ کہنا کہ اردو زبان کے اوّلین نمونوں میں حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کی تصنیف ''خزانۂ رحمت'' کو پندرہویں صدی میں لکھی گئی ''بحر الفضائل'' کے بعد دوسرا نمبر حاصل ہوتا ہے۔

[۸] واضح رہے کہ قدیم ترین تصنیف ''بحر الفضائل'' اس کے مصنف مولانا محمد فضل اللہ بلخی گنی [شارح مخزن اسرار نظامی] نے ۸۳۸ھ مطابق ۱۴۲۴ء] میں لکھی تھی۔ اور حضرت شاہ بہاؤالدین باجن نے اپنے ملفوظات یعنی ''خزانۂ رحمت'' کو برہان پور میں ۸۷۲ھ مطابق ۱۴۷۹ء میں لکھا ہے۔ مطلب یہ کہ ان دونوں مذکورہ تخلیقات میں فرق صرف چونتیس سال کا ہے اور یہ فرق کچھ ایسا زیادہ نہیں کہ اسے اردو زبان کے اوّلین نمونوں کو

جانچنے اور پرکھنے میں زیادہ اہمیت دی جائے۔[تفصیل کے لئے راقم کا مضمون حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کی شاعرانہ عظمت'' شائع شدہ ''ہماری زبان'' مورخہ یکم تا ۷ نومبر ۲۰۰۲ اور ۸ تا ۱۴ نومبر ۲۰۰۲ ملاحظہ فرمائیں۔]

[۹] اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم کی یہ اہم بات بھی پیشِ نظر رکھی جائے کہ ''خزانۂ رحمت'' کا جو نسخہ کراچی یونیورسٹی میں موجود اور محفوظ ہے اس کی ''املائی خصوصیات نویں صدی ہجری کے نوشتہ ''بحر الفضائل'' سے مماثل ہیں۔'' [۱۵]

۱۰۔ ان مذکورہ تخلیقات کے علاوہ ہندوستان میں جن تصانیف کو اردو کے اوّلین نمونے قرار دیا گیا ہے ان پر بقول ''سخنورانِ گجرات'' کے مصنف ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ''لسانی نقطۂ نظر سے یا کسی وجہ کی بنا پر ان کے اصَل ہونے پر شبہ بھی ظاہر کیا جاسکتا ہے۔'' [۲۶]

اس کے ساتھ ڈاکٹر شیخ فرید برہان پوری کی ایک اہم بات اور ملاحظہ فرمائیں۔ وہ کہتے ہیں:

''حضرت شاہ بہاؤالدین باجن ملفوظات لسانی لحاظ سے نہایت اہم ہیں۔ اردو کے قدیم ترین روپ کا مستند نمونہ ہیں۔ نویں صدی ہجری کے نصف آخر کی زبان کے کینڈے کا پتہ چلتا ہے۔ خود جو = تھے ے' اہے = ہے' منھ متں = میں' آپیں = آپ' چکہ = کچ' کچھو = کچھ' اگیں اگہو = آگے' پاچھیں = پیچھے' سریکھا = سریکا' تھانوں تھیاؤں = استھان' کت = کون سا' بھوت = بہت' بہیت = بہت' لوہو لوھو = لہو' چھونک = چھنکارا' لہنا = لینا' پہلو = پہلے' منجہ = مجھ' نیلج = نرلج' جیو = جی' نان = نہیں' نانوں ناو = نام' دنہ = دونوں' ہور = اور' نانگے = ننگے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کا اس سلسلے میں یہ بھی کہنا ہے کہ ''حضرت شاہ باجن نے اپنے خیالات کا اظہار عام زبان میں کیا ہے ان کے مخاطب عوام تھے۔''

دھریں = دھرنہ کریں کرنہ' بلیس بلسنہ / ترسینت ترسنہ / تپئیں تپنہ / پریں پرنہ' جاکیں جاگنہ ماگیں مانگنہ / دریں دریں / چھوڑیں / چھوڑنہ'' [یہ اس زمانے کے جمع مضارع ہیں]

آخر میں ایک اہم بات کی طرف آپکی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ''سخنورانِ گجرات'' اور ''ولی گجراتی'' کے مصنف ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی مرحوم [سابق ایڈیٹر ''نوائے ادب'' بمبئی

متوفی ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء مدفون سورت گجرات] کے مطابق اردو کی ادبی تشکیل کے سلسلے میں ایک شہادت "بحر الفضائل" کے کاتب۔ ظیف محمد بن عبد اللطیف قریشی الدسدی نڈیاد [گجرات] ہیں جب کہ "خزانۂ رحمت" کو اردو کی قدیم شاخ گوجری کے عظیم شاعر حضرت بہاؤالدین باجن علیہ الرحمتہ نے خود تحریر فرمایا ہے۔ ملاحظہ کیجئے آپ کی لکھی ہوئی اس شہادت کو:

ایں فقیر بہاؤالدین المقلب بہ باجن کہ غلام سلطان المشائخ المنقطع اے اللہ مخدوم شیخ رحمت اللہ قدس اللہ سرہ العزیز است۔ بعضے کلمات از زبانِ حضرت ایشاں واز کلماتِ مشائخ سلف و مناقب ایشاں کہ منقول از کتب معتبرہ جمع کردہ بود۔ وانچہ در طبع ایں فقیر گجیدہ و سنجیدہ تحریر بافت وایں رسالہ "خزائن رحمت اللہ" نہاد۔۔۔"

اس کے تحریر فرمانے کی وجہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"باعث نوشتن ایں رسالہ ایں بود کہ مریدان عتقادان ایں خاندان کرام ارشاد بگیرند۔' [نسخہ برہان پور صفحہ ۱۴' نسخہ کراچی صفحہ ۹ شاہ بہاؤالدین باجن ۴۰]

خزانۂ رحمت" [یا خزائنِ رحمت اللہ] کی تالیف کے زمانے کا ایک داخلی ثبوت ملاحظہ فرمایئے جو واقعی بہت اہم ہے اور وہ یہ ہے:

حضرت شاہ بہاؤالدین باجن نے اپنے ملفوظات "خزانۂ رحمت" میں گجرات کے اس زمانے کے مشہور بادشاہ سلطان محمود خلجی کو "مغفور" لکھا ہے۔ سلطان مذکورہ کی وفات ۸۷۳ھ کو ہوئی۔ مطلب یہ کہ یہ ملفوظات "خزانۂ رحمت" ۸۷۳ میں لکھے جارہے تھے۔ یہ کب سے لکھے جا رہے تھے؟ کہنا بہت مشکل ہے پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ملفوظات "خزانۂ رحمت" ضخیم [قریب نو سو صفحات کے ہیں۔] اتنے ضخیم ملفوظات ایک دن یا ایک برس میں تو جمع نہیں ہوگئے ہوں گے۔ حضرت موصوف شاہ باجن نے تحریر فرمایا ہے کہ "بعضے کلمات از زبان ایشاں [شیخ رحمت اللہ سرہ'] واز کلماتِ مشائخ سلف و مناقب ایشاں کہ منقول از کتب معتبرہ جمع کردہ بود۔" [۴۰]۔ اس لئے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ سب "کلمات" جمع کرنے میں کئی برس لگ گئے ہوں گے۔ حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ سیاحی میں

گذرا ہے۔ آپ نے اکیس برس تک اپنے پیر و مرشد حضرت رحمت اللہ کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کرنے کے بعد سیاحت، شروع کی تھی خشکی کی راہ سے 'پہلے حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے' دہلی سے خراسان پہنچے۔ خراسان سے زیارتِ کعبہ کے لئے روانہ ہوئے۔ خواب میں بشارت ہونے کے بعد احمد اباد واپس آئے پھر دولت آباد گئے وہاں سے بیدر گئے پھر دکن سے سیلون گئے۔ واپس احمد آباد آکر مانڈو گئے اور پھر برہان پور دارالسرور تشریف لائے۔ اتنی سیاحت میں کئی برس لگ گئے ہوں گے اس لئے یہ خیال کرنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے خلافت حاصل کرنے کے بعد اور سیاحت شروع کرنے سے پہلے ہی سے بزرگوں کے کلمات ضبطِ تحریر میں لانا شروع کر دیئے تھے۔ گمان غالب ہے کہ جب آپ اپنے پیر و مرشد کی خدمتِ اقدس میں تھے تب ہی سے آپ نے اپنے پیر و مرشد اور دیگر بزرگوں کے کلمات لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ اور آپ نے اپنے سفرِ حجاز کے درمیان ملفوظات لکھنے کا کام جاری رکھا تھا۔ اگر بات ایسی ہی ہے، جیسی کہ قیاس کی جارہی ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حضرت شاہ بہاؤالدین باجن نے اپنے مذکورہ ملفوظات ''خزانۂ رحمت'' پندرہویں صدی ہجری کی چوتھی دہائی میں ضبطِ تحریر میں لانا شروع کر دیئے تھے۔ اس صورت میں ''بحر الفضائل'' اور ''خزانۂ رحمت'' کا زمانۂ تحریر برابر ہو جاتا ہے۔

اس لئے مذکورہ تمام باتوں کے پیشِ نظر یہ بات کھل کر کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شاہ باجن کی ''خزانۂ رحمت'' ایک ایسی حقیقت ہے جو دِن کی طرح روشن ہے جس میں شک و شبہ کا اندھیرا نام کو بھی نہیں ہے۔ یہ نویں صدی ہجری کے نصف اوّل کی املائی خصوصیت تمام تر لئے ہوئے ہے۔ اس کی قدامت مسلم الثبوت ہے۔ اس کے دنیا میں ایک نہیں تین نسخے موجود و محفوظ ہیں۔ اور وہ بھی بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب جیسی عظیم المرتبت اور مایہ ناز عالموں کے مطالعہ میں برسوں رہنے کے بعد مشہورِ زمانہ یونیورسٹیوں میں محفوظ کرائے گئے ہیں۔ اس کی تاریخی' لسانی' شعری و نثری عظمتوں اور خوبیوں پر ہمارے قابلِ قدر عالموں نے گراں قدر مقالات تحریر فرمائے ہیں جو ہمارے عظیم اور بیش بہا ادب کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

حضرت شاہ بہاؤالدین کا شمار نویں صدی ہجری [قریب پندرہویں صدی عیسوی] کے عظیم المرتبت

صوفی بزرگوں میں ہوتا ہے۔ برہان پور دارالسرور کو جو کہ ماضی میں علم و ادب کا بڑا مرکز تھا' اولیاء خیز کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں غلام علی آزاد بلگرامی کی مرصع غزل کا ایک شعر بہت مشہور ہے' اور وہ یہ ہے:

زہے مقامِ مقدس کہ اولیاء خیز است
کند شہپرِ طواف فضائے برہان پور

اس شہر کو مذکورہ عالم اور شاعر آزاد بلگرامی نے اس لئے اولیاء خیز کہا ہے کہ یہاں حضرت شاہ بہاؤ الدین باجن جیسے عظیم المرتبت روحانی بزارگ اور ولیٔ کامل 'نہ صرف یہ کہ آسودۂ خواب ہیں' بلکہ آپ کی شاندار درگاہ برسہابرس سے مرجع خلائق بھی بنی ہوئی ہے۔

آپ [شاہ باجن] صوفی بزرگ ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجے کے فاضل اجل اور بلند پایہ شاعر اور نثار بھی تھے۔ عربی" فارسی اور گوجری زبانوں پر آپ کو ایسا عبور حاصل تھا کہ جس سے آپ انہی زبانوں میں اپنے دلی جذبات کا اظہار نہ صرف یہ کہ نثر میں آسانی کے ساتھ کرتے تھے بلکہ ان زبانوں میں آپ عمدہ اور بہترین شاعری آسانی اور روانی کے ساتھ کرتے تھے۔ اس لئے ان تینوں زبانوں کے شعرائے متقدمین میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔ آپ ان تینوں مذکورہ زبانوں میں الگ الگ شعر کہتے تھے اور ان تینوں زبانوں کو ملا کر بھی گنگا جمنی شاعری کیا کرتے تھے۔ جس سے آپ کا شمار ریختہ کے اولین شعراء میں بھی ہوتا ہے۔

آپ ان تینوں زبانوں کے کتنے عظیم شاعر ہیں؟ اس کا صحیح اندازہ آپ کے ان ملفوظات "خزانۂ رحمت" کو دیکھ کر اچھی طرح لگایا جاتا ہے جس میں آپ کی تینوں زبانوں میں کی گئی شاعری کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہمارے جن علمائے کرام نے آپ کے ملفوظات "خزانۂ رحمت" کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے وہ آپ کی تینوں زبانوں میں کی گئی بہترین شاعری کے نہ صرف 'یہ کہ دل سے قائل ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے آپ کی شاعری پر تفصیلی مقالات و مضامین بھی قلمبند کر کے موقر جریدوں میں شائع کروائے ہیں۔ یہ وہ بہترین خوبی ہے' جو آپ کو اپنے ہم عصر عالموں اور شاعروں میں مقبول اور ممتاز کئے ہوئے ہے۔

یوں باجن باجے راے = اَسرار چھاجے رے
مندلی من میں دھمکے = رباب انگ میں جھمکے
یہ پاواشہ کاہاوا = ان دے سک دکہ گنواوا
ان ہر کوں حق حق لاوا

اب آیئے میں آپ سے حضرتِ شاہ باجن کی اس نظم کے تعلق سے کچھ عرض کروں' جو میں نے اوپر کے مضمون کے شروع میں درج کی ہے:

اس نظم کو لکھنے کے بعد دوبارہ اس مذکورہ نظم کو ڈاکٹر مدنی مرحوم نے پروفیسر محمود شیرانی صاحب کی درج کی ہوئی نظم بھی قارائین کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں:

یہ فتنی کیا کیسے ملتی ہے = جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
اوّل ان چھل بہت چھلائے = ان چھوہری بہتی کھلائے
ان راکر بہت رولائے
یہ فتنی کیا کسے ملتی ہے = جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
ان گھیرے پارے = جے اس تھی بلکے ولے ان چھارے
جے اس تھے تارے = ولے نہ جانے اس تھی ہارے
جے کارنہ نسپتہ ترسفہ = جے چکہ طے تو اس سفہ بلسفہ
یہ فتنی انھوں نے تپاوے = جے کہ پاس انہوں ناوے
جے اس کدھی نہ لوریں = بے چکہ ملے ت بھی اسی چھور نہ [نیں]
بے دیکھے اس تھے بھاگے = یہ نیلج ان سفہ لاگے
تخلص: دیکھ باجن یہ تو جھوٹی = دکھ میٹھی جب عیٹھی
یہ اب ایسی ڈھیٹی = یہ کیا کیسے ملتی ہے

ڈاکٹر مدنی مرحوم اور حافظ محمود شیرانی نے شاہ باجن کی جو نظم درج کی ہے اس نظم کے پہلے شعر میں کوئی فرق نہیں ہے دوسرے شعر کے مصرعِ اولیٰ میں مدنی صاحب نے ''چھل'' لکھا ہے جب کہ شیرانی صاحب نے اول ''ان چھل'' لکھا ہے اس میں اول زائد ہے۔ اس شعر کے مصرعِ ثانی میں یہ فرق ہے کہ مدنی صاحب نے ''ان رو کر بہت رولائے'' لکھا ہے اور شیرانی صاحب نے ''ان چھوری بہتی کھلائے'' لکھا ہے اور پھر تیسرے شعر کے پہلے مصرع کو روپ میں ''ان

رو کر بہت رولائی ہے" تحریر کیا ہے۔

واضح رہے کہ حضرت شاہ بہاؤ الدین باجن نے آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے یہ نظم لکھی تھی۔اس زمانے میں بڑی ے اور چھوٹی ی کا فرق نہیں تھا[یائے معروف اور یاے مجہول]۔

مدنی صاحِب نے جو چوتھا شعر لکھا ہے اسے شیرانی صاحب نے نہ لکھتے ہوئے اس نظم کے پہلے شعر کو دوبارہ تحریر فرمایا ہے۔

پانچویں شعر میں بھی فرق ہے وہ اس طرح کہ مدنی صاحِب نے اس شعر کے مصرعِ ثانی کو اس طرح لکھا ہے:

ولے جانے نہ اس تے پار لے

جب کہ شیرانی صاحِب نے اس مصرع کو اس طرح لکھا ہے:

ولے نہ مانے اس تھے پار لے

باقی کے شعروں میں کچھ فرق نہیں ہے۔شعروں کی تعداد برابر ہے۔

شاہ باجن اس مذکورہ نظم کو کتاب "تاریخِ اولیائے کرام برہان پور" کے مصنف نے بھی اپنی اس کتاب میں درج کیا ہے۔ آپ نے اس نظم کو درج کرنے سے پہلے یہ عبارت اور عنوان تحریر فرمایا ہے:

"دنیااور حُبِ دنیا" شاہ باجن نے فرمایا کہ دنیااور حبِ دنیا مثل ٹھگ کے ہے کہ طالب کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ حاصل کرنا ہے اِس وقت حاصل کرلے تاکہ ضعیفی کے وقت تیرے اور تیری اولاد کے کام آوے۔ مطلوبِ دنیا وہ ہے کہ جوانی ضائع کرتا ہے اور آخری عمر میں ضعیف ہو جاتا ہے اور خدائے عزّ و جل کی عبادت نہیں کرسکتا اور اعلیٰ مرتبہ پا نہیں سکتا۔" اس لئے حضرتِ باجن نے صفتِ دنیا کو اس طرح ہندی میں کہا ہے:

یہ فتنی کیا کس ملتی ہے = جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

ان چھل بہت چھلائی ہے = ان رو کر بہت رولائے

اس بلکی ویران جھاری = ولے جی رہے استھی نیارے

وہ جائے استھی بارے

اس کارن تب نہ ترسفہ = جگ ملے تو اس سفہ بلسفہ

یہ فتنی انھیں تپاوے = جگ پاس ناخوں آوے

جی اسم کدھے لورنہ = جو ملے تو بھی اس چھوڑنہ

جی دیکھت اس بھی جھاگے = یہ نیلچ ان سنہ لاگے

دیکھ باجَن یہ تو جھوٹی = مکھ میٹھی جت پیٹھی

یہ آدمی ایسے ڈھیٹی

ایڈوکیٹ مرحوم کی شاہ باجن کی درج کردہ نظم میں اور مدنی مرحوم اور حافظ محمود شیرانی نے جو مذکورہ نظم اپنی اپنی کتابوں میں درج کی ہے ان میں تھوڑا فرق ہے جو اس طرح ہے:

ان کے درمیان مذکورہ نظم کے پہلے اور دوسرے شعر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن تیسرے شعر کو ایڈوکیٹ مرحوم نے مصرعِ اولیٰ اور مصرعِ ثانی کے ساتھ لکھا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر مدنی مرحوم نے تیسرے شعر کا صرف مصرعِ اولیٰ لکھا ہے [ان چھوکر بہت چھلائے] لیکن مصرعِ ثانی نہیں لکھا ہے۔

اور محمود شیرانی صاحب نے تیسرے شعر کو دوسرے شعر کے طور پر لکھا ہے۔ اس میں بھی مصرعِ اولیٰ کے لکھنے کے بعد مصرعِ ثانی "ان روکر بہت رولائے" نہ لکھتے ہوئے یہ لکھا ہے "ان چھوہری بہت کھلائے"۔ ایڈوکیٹ مرحوم نے جو چوتھا شعر [اس کبھی ویران جھاری ولے جی رہے استھی نیاری] لکھا ہے۔ اسے ڈاکٹر مدنی مرحوم اور محمود شیرانی صاحب نے نہیں لکھا ہے۔ بلکہ چھٹے شعر کے طور پر "جے اس تھی تارلے ولے نہ جانے اس تھی پارلے" تحریر کیا ہے۔

ایڈوکیٹ مرحوم کے لکھے ہوئے چھٹے شعر کو محمود شیرانی صاحب نے ساتویں شعر کے طور پر لکھا ہے۔ ساتویں شعر کو شیرانی صاحب نے آٹھویں شعر کے طور پر لکھا ہے تھوڑے فرق کے ساتھ ان کے درمیان نویں شعر میں بھی تھوڑا فرق ہے۔ ایڈوکیٹ مرحوم کے لکھے ہوئے دسویں شعر میں بھی نمبر وغیرہ کا فرق ہے۔

دسویں شعر کو ایڈوکیٹ مرحوم نے شاہ باجن کے مقطع کے طور پر لکھا ہے اور شیرانی صاحب نے اس

شعر کو گیارہویں شعر کے طور پر لکھا ہے۔ایڈوکیٹ مرحوم نے گیارہویں شعر کا صرف مصرع "یہ آدھی ایسے ڈھیئی" لکھا ہے لیکن مصرع ثانی نہیں لکھا ہے۔

شیرانی صاحب نے اس شعر کا مطلع ثانی "یہ کیا کسے ملتی ہے" لکھا ہے۔ آپ [محمود شیرانی صاحب] نے اس شعر کو بارہویں شعر کے طور پر لکھا ہے۔

شاہ باجن کی اس نظم کو ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے بھی اپنی گراں قدر تصنیف "شاہ بہاؤالدین باجن" میں "خزانۂ رحمت" کے اس نسخے کو پیشِ نظر رکھا ہے جو برہان پور کی شاہی جامع مسجد کے پیش امام صاحب کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے اور جسے نسخہ برہان پور کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس نظم کو درج کرنے سے پہلے وہ عبارت بھی لکھی ہے جو حضرت شاہ بہاؤالدین باجن نے اپنی اس مذکورہ نظم کے تعلق سے اپنے ملفوظات [قلمی] "خزانۂ رحمت" میں تحریر فرمائی ہے۔وہ عبارت یہ ہے:

"قاطعِ سیم را بزبانِ ہند ٹھگ خوانند۔ آں دنیا وحبِ دنیا است وپیشِ طالب ایں رآید وگوید کہ چیزے حاصل کرن کہ وقتِ پیری تراو فرزندانِ ترا کار آید وایں بود حرکت در طلب کردن حاصل نہ شود وبدست نیاید کہ مطلوبِ دنیا ایں است کہ وقتِ کار کہ خلاصۂ جوانی ضائع رود ودر وقتِ پیری ضعیف خواشد عباداتِ خدائے عزّوجل نتوانی کرد بمرتبہ اعلیٰ نرسد۔"

اس عبارت کا ترجمہ جناب بشیر محمد خان ایڈوکیٹ مرحوم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے جسے میں اوپر لکھ چکا ہوں۔

"در صنعتِ دنیا ایں درویش بزبانِ ہندی گفتہ است۔"

گوجری

یہ فتنی کیا کس ملتی ہے = جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

آن چھیل بہت جھلائے = ان روکر بہوت رولائے

ان جھوکر بہتے کھائے = ان بہت گھیر لے پارلے

اس بلگے وے ان جھار لے = جے رہے اس تجے ٹارے

و لے جائیں نہ اس تہے پارے

اس کاج جی تیو نہ ترسنا = جگ ملے اس سنہ بلسفہ

یہ فتنی انھیں تیادے = جگ پاس نہ نانہہ کی آوے

جے اس کوں کدھی نہ لورے = جو ملے تو تب ہی چھورے

جی دیکھت اس تہے بھاگے = یہ نیلج اس سوں لاگے

دیکھ باجن یہ تو جھوٹی = مکھ موں میٹھی من موں نیھٹی

یہ آہے ایسے ڈھٹی

نظم کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے شاہ باجن کی عبارت قلمی مفوظات ''خزانۂ رحمت'' سے درج کی ہے۔ ملفوظات کی عبارت [فارسی کی] اس طرح ہے:

''بداں کہ صفتِ دنیا سایہ دارد اگر کسے خواہد کہ خود را بگیرد و سایہ پیش پیش بگریزد و اگر ایں شخص از سایہ رو بگردند سایہ از ایں برود دنیا ایں خصلت دارد کہ ایں را خواہد اور انخواہد و اگر حاصل شود خوردن ندید گوید ذخیرہ کن وقت سخت تراو فرزندان ترا بکار آید۔ دراں وقتِ سخت درستی پدید آیدو ہم در آں طلب و ر تشویش ماند۔ ایں باز خود بہ محل دیگر ظہور کند مقصودِ دنیا و خبِ دنیا ہمیں است کہ ایام عمر کہ برائے توشۂ آخرت است ضائع رود و طالب بمراد نرسد۔'' [بحوالہ نسخہ برہان پور صفحہ ۳۲۱ ' نسخہ کراچی صفحہ ۳۷۔ ۲۷۲ ' اور ینٹل کالج میگزن نومبر ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۱۸ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل پنجاب میں اردو صفحہ ۴۱۔ ۴۰ ' اردو کے نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' صفحہ ۲۸ اور شاہ بہاؤالدین باجن صفحہ ۴۔ ۱۰۳]۔

ڈاکٹر صاحب موصوف اور ایڈوکیٹ بشیر محمد خان صاحب نے اس نظم کو اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ ان میں اختلاف بہت کم ہے اور جو اختلاف بھی ہے وہ قدیمی ملفوظات سے نقل کرنے کے اپنے اپنے انداز کی وجہ سے ہے اور قدیمی ملفوظات کی لکھاوٹ کو سمجھنے کے سبب سے ہے۔ مثال کے طور پر اس نظم کے چھٹویں شعر میں ایک لفظ ''کارن'' ہے اسے ایڈوکیٹ مرحوم نے ''کاج'' لکھا ہے۔۔۔ وہ قدیم ملفوظات کی لکھاوٹ کی وجہ سے ہے۔ اسے ایڈوکیٹ مرحوم نے ''کاج'' لکھ دیا اور ڈاکٹر مرحوم

نے "کارن" سمجھا تو انھوں نے "کارن" لکھ دیا۔ اسی طرح کا ایک لفظ "اسم" ہے جو کہ مذکورہ شعر کے آٹھویں شعر میں ہے' اسے ایڈوکیٹ مرحوم نے اسم لکھا ہے تو ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے "اسکون" لکھ دیا ہے۔ اسی طرح نظم کے دیگر اختلاف کے لئے بھی خیال کرنا چاہئے کہ ملفوظات کی قدیمی لکھاوٹ کی وجہ ہے۔

ڈاکٹر مدنی اور حافظ محمود شیرانی مرحوم کی نقل کردہ نظم سے جو فرق [اختلاف] اس کی ایک وجہ ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ:

"پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی کے پاس "خزانۂ رحمت" کا نسخہ بارہویں صدی کے خاتمہ کا لکھا ہوا تھا وہ غلط ہے۔"

اس تعلق سے ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی کتاب میں تین جگہ لکھا ہے پہلے تو صفحہ لکھا ہے اور دوبارہ صفحہ ۲۰ پر اس طرح لکھا ہے:

"پروفیسر شیرانی مرحوم کا "خزانۂ رحمت" کا جو نسخہ موسوم بہ "گلستانِ رحمت" تھا' وہ بارہویں صدی کا سخت غلط نسخہ تھا۔ ناقص الآخر تھا۔"

اور تیسری بار صفحہ ۲۱ پر لکھا ہے کہ:

"شیرانی صاحب کے پاس بارہویں صدی [ہجری] کے خاتمہ کا مکتوبہ سخت غلط تھا۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے مایہ ناز ادیب و محقق حافظ محمود شیرانی نے اپنی بہترین تصنیف "پنجاب میں اردو" میں جو بہت سے باتیں ملفوظات کے تعلق سے [اور شاہ باجن کے تعلق سے] تحریر فرمائی ہیں' وہ صحیح اور درست نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر شیرانی صاحب نے اپنی کتاب میں ۴۰۔ ۳۳ اور مقالاتِ شیرانی جلد اوّل میں ۶۸۔ ۱۶۷' ۱۶۹۔ ۴۔ ۳۰۱ پر حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کے کلام کو "دہلوی" لکھا ہے' وہ صحیح اور درست نہیں ہے اس کے تعلق سے ڈاکٹر شیخ فرید نے لکھا ہے کہ:

"اشتباہ ہے کہ بزبانِ دہلوی کا عنوان بعد کا اضافہ الحاق ہے۔ راقم [ڈاکٹر فرید مرحوم] کے پیشِ نظر جو نسخے ہیں' ان میں لفظ "دہلوی" نہیں ہے۔"

اسی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"بابائے اردو عبدالحق صاحب کو ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۱ء میں "خزانۂ رحمت" کا ایک نسخہ قلمی ملا تھا۔ وہ نسخہ ان کے [بابائے اردو کے] مطالعہ میں برابر رہا ہے۔ اس میں کہیں بھی "دہلوی" لفظ نہیں لکھا ہے۔ ان کے [شیخ فرید] کے مطابق ڈاکٹر عبدالحق نے "اردو کی نشوو نما میں صوفیائے کرام کام" میں شاہ باجن کے کلام کو دہلوی نہیں لکھا ہے۔ بابائے اردو نے اس تعلق سے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ "تاریخ برہان پور" کے مصنف کے قول [اس زمانے میں ملک ہند کی طرز بیاں اور "پنجاب میں اردو" سے چند اشعار نمونے کے طور پر لکھ دیے گئے ہیں۔" [۲۰]

اس کے ساتھ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''جمیل جالبی صاحب نے ''تاریخ ادب اردو'' میں تین چار مقالات پر شاہ باجن کے کلام کی زبان ''دہلوی'' لکھا ہے۔ جس نسخے سے انھوں نے [جمیل جالبی نے] وہ حوالے دیئے ہیں اس میں کہیں بھی دہلوی مرقوم نہیں ہے۔ [بحوالہ ''تاریخ اردو ادب'' صفحہ ۱۷۸۔ ۱۰۸۔ ۵۶ اور ''شاہ بہاؤالدین باجن صفحہ نمبر ۲۰'']

گراں قدر تصنیف ''مقدمہ تزبانِ اردو'' کے مصنف ڈاکٹر نسعود حسین خان صاحب نے مذکورہ تصنیف اور اپنے دیگر لسانی مقالات میں کئی جگہ شاہ باجن کے کام کو دہلوی لکھا ہے' وہ بھی صحیح اور درست نہیں ہے۔ کیوں کہ بقول ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم اور ڈاکٹر مسعود حسین خان صاحب کے پیشِ نظر ''خزانہ رحمت'' کا کوئی نسخہ نہ تھا۔[۲۱]

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ میں آخر اس بات پر کیوں زور دے رہا ہوں کہ شاہ باجن کی زبان دہلوی نہیں گوجری یا ہندی ہے۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ شاہ باجن کے کام کو دہلوی کہنے سے یہ مطلب اخذ ہوتا ہے کہ شاہ باجن کا کلام دہلوی زبان میں کہا ہوا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کی شاعری کی قدرو منزلت کم ہو جاتی ہے بلکہ آپ کی شاعری کی اہمیت صفر ہو جاتی ہے۔ اور اس سے اردو زبان وادب میں حضرت شاہ باجن کو جو اعلیٰ وارفع مقام ملنا چاہیئے وہ نہیں ملتا اور نہ ہی اس سے ذہن میں حضرت شاہ باجن کی شاعری کی وہ اوّلیت ہی دی جاسکتی ہے' جو اسے ملنی چاہیئے۔

اس لئے اس بات پر زور دینا کہ حضرت شاہ باجن کے کلام کی زبان دہلوی ہے میرے خیال سے آپ کے [شاہ باجن ؒ کے] ساتھ ادبی ناانصافی ہے۔

مثال کے طور پر اگر میں یہ کہوں کہ ولی گجراتی کا پورا کلام دہلوی زبان میں ہے تو اس کا اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں لیا جائے گا کہ ولی گجراتی نے دہلوی زبان میں شاعری کی ہے۔ یہ بات حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ولی گجراتی جب پہلی مرتبہ [۱۷۰۷ء میں] دہلی گئے تھے تو ان کی تمام شاعری دکنی اور گجراتی طرز پر تھی' جو دہلی میں بہت مقبول ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ولی دکنی نے اپنے استادِ محترم حضرت شاہ سعد اللہ گلشن کے ارشاد پر دہلوی طرز پر کلام کہنا شروع کیا تھا۔ دہلوی طرز پر ولی گجراتی کو تسلیم کرنے سے ان کی اس تمام شاعری کی اہمیت کم ہو جاتی ہے' جو انھوں نے دکنی اور گجراتی طرز میں کہی ہے۔

حقیقت کے اظہار کے لئے ''سخن ورانِ گجرات'' کے مصنف ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی مرحوم نے [ولی گجراتی'' کو ''ولی دکنی'' کہنے پر ایک پوری کتاب ''ولی گجراتی'' کے عنوان سے لکھ دی ہے۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ زبان و ادب میں ذرا سی غلط فہمی بھی نقصان دہ ہے۔ اس لئے زبان و ادب میں ذرا سی غلط فہمی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار حوالہ جات اور مثالیں ضبطِ تحریر میں لائی جاسکتی ہیں۔ ار ... ی

ادبی غلط باتوں کی تردید کی جاتی ہے اور اخبارات ورسائل میں مقالات اور مضامین لکھے جاتے اور شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے ادبی غلط فہمی کے بڑھنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔اس سے کسی کی تذلیل کرنا مقصود نہیں۔

بالکل یہی بات حضرت بہاؤالدین باجن کی شاعری کے متعلق کہی جاسکتی ہے کہ آپ نے [شاہ باجن نے] دہلوی زبان میں شاعری نہیں کی ہے۔اور نہ ہی زبانِ دہلوی کے نمونے پیش کئے ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب [جن کا میرے دل ودماغ میں بڑا احترام ہے۔] فرماتے ہیں۔ موصوف نے شاہ باجن کی مذکورہ نظم [یہ فتنی کیاکسے ملتی ہے = جب ملتی ہے تب چھلتی ہے] کواپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں درج کرنے سے پہلے لکھاہے کہ "ابوالفضل کے "آئین اکبری" دہلی کی زبان کواسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن شاہ باجن پہلے شخص ہیں جو دہلی کا نمونہ دیتے ہیں ۔وہ [شاہ باجن] اس کو ہندی کے نام سے بھی پکارتے ہیں ۔جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ہندی اور زبانِ دہلوی ایک ہی چیز ہے [بحوالہ بہاؤ الدین باجن] میں اوپر یہ بات کہہ چکا ہوں اور پھر زور دے کر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آپ [شاہ باجن] نے جس زبان میں شاعری کی ہے اسے کبھی دہلوی نہیں کہا ہے۔پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے قابلِ احترام اور مایہ ناز ادیب اور محقق حضرات نے اس بات پر کیوں زور دیا ہے جو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی ہے۔

اپنے قلمی ملفوظات میں حضرت شاہ بہاؤالدین باجن نے صاف لفظوں میں تحریر فرمایا ہے کہ

"در صفتِ دنیا ایں درویش بزبانِ ہندی گفتہ است۔"

اور ایسا شاہ باجن نے ایک بار نہیں کئی بار کہا ہے۔ پھر دہلوی کی غلط فہمی کیوں؟

کیا شاہ باجن کی شاعری دہلوی زبان میں ہے؟ یا آپ کی شاعری پر دہلوی زبان کے اثرات ہیں؟ یا پھر آپ کی شاعری میں دہلوی زبان کے الفاظ زیادہ ہیں؟ ان میں سے کوئی بھی بات صحیح اور درست نہیں۔ نہ تو آپ کی شاعری بزبانِ دہلوی ہے اور نہ آپ کی شاعری پر دہلوی زبان کے اثرات ہیں۔اور نہ ہی آپ کی شاعری پر دہلوی زبان کے وہ الفاظ زیادہ تر ہیں جن کو ہریانہ' پنجاب اور سندھ کے الفاظ کہتے ہیں۔اگر ایسا ہوتا تو کتاب "سخنوانِ گجرات" کے مصنف ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی اپنی اس مذکوہ کتاب میں تحریر نہیں فرماتے جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اردو کئی زبانوں سے یاد کی گئی ہے مثلاً ہندی ہندوی ہندوستانی 'زبانِ ہندوستان' ریختہ زبان' اردوئے معلی علاقائی مناسبت سے اردو کے نام گجروی اور دکنی سب سے زیادہ قدیم ہیں" [۲۹]

یہ اقتباس میں نے ڈاکٹر مدنی مرحوم کے اس مقالہ سے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا ہے جو موصوف نے ڈاکٹریٹ [پی۔ایچ۔ڈی۔] کے لئے بمبئی یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔اور جہاں سے آپ کو اردو میں ڈاکٹریٹ کی سند سے نوازا تھا۔ یہ مقالہ پروفیسر سیّد نجیب اشرف صاحب ندوی' پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ڈار' ڈاکٹر رحمان

صاحب [پرنسپل اسماعیل یوسف کالج بمبئی] ' ڈاکٹر رحمٰن صاحب کے مشورے سے اوران کی نگرانی میں تیار کیا گیا تھا اس سلسلے میں درج ذیل ادبی بزرگوں سے بھی آپ [مدنی صاحب] کو ادبی اعانت ملی۔

[۱] بابائے اردو عبد الحق صاحب [۲] قاضی عبد الودود صاحب [بار ایٹ لا] [۳] مولانا مہر محمد شہاب مالیر کوٹلوی [۴] ڈاکٹر محی الدین صاحب زور [۵] ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی [۶] علامہ سیّد محمد مطیع اللہ راشد برہان پوری [۷] عبد القادر نور الدین اور [۸] عبدالرزاق صاحب۔

ان ادبی بزرگوں کے ادبی مشورے اور مصنف کے نظر ثانی اور کتر بیونت کے بعد یہ مقالہ ایک نئی شکل اختیار کر کے ''سخنورانِ گجرات'' کی صورت میں ترقی اردو بیورو' نئی دہلی کی جانب سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ معتبر اور مستند تصنیف ہے۔ جس کا اقتباس میں نے دیا ہے اب اس اقتباس کے پیشِ نظر میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

اردو کی تاریخ کی یہ ایک تسلیم کی ہوئی حقیقت ہے کہ ماضی میں اس کے کئی نام تھے کوئی اسے ہندی [ہندوی ' ہندوستانی ' زبانِ ہندوستان ' ریختہ زبان وغیرہ] کے نام سے اور کوئی گجری اور دکنی کے نام سے یاد کرتا تھا مگر۔۔۔

علاقائی مناسبت سے اردو کے نام گجری اور دکنی سب سے زیادہ قدیم ہیں۔ ان ناموں میں ''دہلوی'' بھی آجاتا ہے۔ کیوں کہ یہ بھی علاقائی ہے۔ اس حساب سے گجری اور دکنی قدیم ترین اور اس زمانے کی گجری اور دکنی شاعری بھی دہلوی کے اس زمانے کے شاعروں کے مقابلے میں قدیم تر ثابت ہوئے ہیں۔

اس بات کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت شاہ بہاؤ الدین باجن [۹۱۲ھ ۔ ۷۹۰ھ] دہلوی شاعروں کے مقابلے میں قدیم تر شاعر ہیں یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی طرح بھی جھٹلائی نہیں جاسکتی۔

حضرت شاہ باجن کے تقریباً ڈھائی سو برس بعد مشہور روحانی بزرگ اور عظیم المرتبت شاعر اور ولی گجراتی کے استادِ محترم حضرت شاہ سعد اللہ گلشن [پیدائش برہان پور دار السرور اور متوفی ۱۱۴۱ھ دہلی] ہوئے ہیں۔ آپ کے [شاہ گلشن] کے سلسلے کے جتنے بھی نامور اور قابلِ ذکر شعراء ہوئے ہیں وہ بھی بعد کے شعراء ہیں۔ ان میں خواجہ ناصر عندلیب ' خواجہ میر درد ' شاہ نصیر ' شیخ استاد ابراہیم ذوق [استادِ محترم بہادر شاہ ظفر] ' مرزا داغ دہلوی وغیر ہم] حضرت شاہ باجن سے صدیوں بعد کے شاعر ہیں۔

مرزا اسد اللہ غالب اور مومن خان مومن اور دہلی کے دیگر مشہور شعراء بھی بہت بعد کے شعراء ہیں۔ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ باجن کا کلام ''بزبانِ دہلوی'' ہے؟ جب کہ حضرت شاہ باجن دہلوی زبان میں شاعری کرنے والے شعراء کرام سے ڈھائی تین سو سال پہلے دہلی سے کوسوں دور دکن کے برہان پور میں بزبانِ گوجری اور ہندی شاعری کر رہے تھے۔ سوچئے تو سہی یہ کیسی الٹی گنگا بہانے والی بات ہے کہ حضرت شاہ نے اپنے سے ڈھائی تین سو

برس کے بعد کے شاعروں کی زبان[دہلوی] میں شاعری کی ہے۔یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے۔یہ تو ویسی ہی بات ہوئی جیسے کہ کوئی کہے کہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی مرضی و اجازت سے ظہیر الدین بابر نے ہندوستان پر چڑھائی کی تھی ؟جب ایسا کہنا غلط ہوگا تو پھر شاہ باجن کے کلام کو بزبانِ دہلوی کہنا کیا سراسر غلط نہیں ہوگا؟اور ایسا کہنے سے اردو کی شاخ زبان گجری کے قدیم ترین شاعر حضرت شاہ باجن کو دہلوی زبان کا شاعر کہنے سے آپ[شاہ باجن] کے ساتھ ادبی ناانصافی نہ ہوگی ؟اگر ناانصافی ہوگی تو پھر اس ناانصافی کا ازالہ کیسے ہوگا؟اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ اس کا ازالہ تبھی ممکن ہے جب ہم اس بات کی پُرزور طور پر تردید کریں کہ حضرت شاہ باجن کا کلام بزبانِ دہلوی نہیں ہے۔ہاں' [آپ] شاہ باجن گجری[اور ہندی] کے ایسے عظیم اور قدیم ترین شاعر ضرور ہیں جس میں آپ کو اوّلیت حاصل ہے۔اس سلسلے میں ذیل کا اقتباس ثبوت کے لئے کافی ہے:"گماں نکنند کہ ہیچ اولیاء بہ زبانِ ہندی تکلم نہ کردہ زیرا کہ اوّل از جمیع اولیاء قطب الا قطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملۃ والدین قدس سرہ' بدین زبان سخن فرمودہ۔بعد ازاں حضرت گنج شکر قدس سرہ' و حضرت خواجہ گنج شکر در زبان ہندی و پنجابی معضے از اشعار نظم فرمودہ۔چنانچہ در مردم مشہور اند۔" [سخنورانِ گجرات][مطلب]:خیال نہ کریں کہ کسی بھی روحانی بزرگ[اولیاء] نے ہندی زبان میں گفتگو نہیں کی ہے۔حالانکہ روحانی بزرگوں میں سب سے پہلے حضرت خواجہ معن الدین چشتی علیہ الرحمتہ نے اور بعد میں حضرت فرید گنج شکرؒ نے اس زبان میں کلام کہا ہے اور گنج شکر نے ہندی اور پنجابی زبانوں میں نظمیں کہی ہیں۔جو عوام میں مشہور ہیں۔ابھی کئی شہادتیں ملتی ہیں کہ صوفیاء درس وتدریس کا فرض انجام دیتے تھے۔

جس میں وہ بھی مخلوط زبان کو استعمال کرتے۔اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو گجرات کے ایک بزرگ شیخ بہاؤالدین باجن کی تخلیقات کو اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔[۳ سخنورانِ گجرات]

اب ہندی اور دہلوی زبان کے تعلق سے ڈاکٹر مدنی مرحوم نے جو وضاحت فرمادی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ باجن نے جس زبان کو دہلوی لکھا ہے وہ مخلوط بولی کا روپ ہے۔جس کو دہلوی کہا گیا ہے وہ دہلی کی رائج الوقت ہندی زبان معلوم ہوتی ہے۔"خزانۂ رحمت"کا جو نسخہ برہان پور میں دستیاب ہے اس میں دو نظموں پر لفظ گجری لکھا ہوا ہے۔اراس میں لفظ دہلوی کسی نظم پر درج نہیں پہلے پہل ہندی اور گجری دونوں نام مخلوط بولی کے لئے استعمال ہوتے تھے[۳۰]

واضح رہے کہ مخلوط زبان اردو کے نام سے مشہور ہوئی اس سے قبل اس کو ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔[۲۹] برہان پوری نسخہ میں اس نظم پر دہلوی نہیں ہے۔[۳۵-۴۰]اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گجری اور ہندی اردو کے قدیم ترین نام ہیں جن میں حضرت شاہ بہاءالدین نے شاعری کی ہے۔

شاہ باجن کے قلمی ملفوظات برہان پور میں بھی موجود اور محفوظ ہیں۔ اور اورینٹل کالج لاہور میں بھی محفوظ ہیں اور کراچی یونیورسٹی میں بھی موجود ہیں۔ ان ملفوظات میں آپ کا [شاہ باجن کا] کلام نہ صرف یہ کہ جگہ جگہ بھرا پڑا ہے بلکہ ملفوظات کے "خزینۂ ہفتم" کو ہم حضرت شاہ باجن کا خود آپ کے ذریعے ترتیب دیا ہوا مجموعۂ کلام کہہ سکتے ہیں ۔ جو آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے کی یادگار بتایا گیا ہے۔ اس میں بقول ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم گوجری اشعار کی تدوین کا اس میں ہمیں قدیم ترین نمونہ ملتا ہے۔ [۲ مقدمہ شاہ بہاؤالدین باجن "خزانۂ ہفتم" کے تعلق سے خود شاہ باجن نے اپنے ملفوظات میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ:

"در ذکرِ اشعار کہ مقولہ ایں فقیر است بزبانِ ہندوی گجری خوانند و قولانِ ہند آنرا در پردہ ہاو سرودمی نوازند بعضے در مدح پیر و دستگیر و وصفِ روضہ ایشاں و وصفِ وطن خود کہ مقام گجرات است و بعضے در ذکرِ مقصد مقصودات مریدان و طالبان و بعضے در ذکرِ عشق و محبت درایں خزینہ بالتفصیل جمع کردہ شد بنام پردہ ہاو سرودہا۔" [۱۴]

[نمبر ۲۱ برہان پور نسخہ اور نمبر ۴۴ شاہ بہاؤالدین باجن]

اسی کے ساتھ حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کی ایک اور بہترین نظم بھی ملاحظہ کیجئے جس میں حضرت موصوف نے اپنے خطرات میں گھرے ہونے کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ پڑھنے والے کو خود خطرات میں گھرے ہونے کے ساتھ اپنی بے بسی کا بھی شدید احساس ہوتا ہے۔ نظم دیکھئے کتنی سیدھی سادی اور سلیس الفاظ میں ہے مگر کتنی پُراثر ہے ملاحظہ فرمائیے کہتے ہیں:

میر اتروی رے سب باتوں ار کھوال

لو کھٹ گھاٹ اتار نہار

بکٹ ڈونگر پگ میں کائیاں

باگھ بسے جس ٹھاؤں

سب بن کھنڈ کا توہی راجا

تری واری جاؤں

پہلے اس نظم جو مشکل الفاظ ہیں ان کے معنی سمجھ لیجئے تب آپ کو نظم سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہوگی۔

تردلے = تراولے 'پار لگاوے مراد ار لگانے والا یعنی پروردگار 'رکھوال = محافظ 'حفاظت کرنے والا 'بان = کشتی 'بکٹ ڈونگر = دشوار گزار گھاٹ کٹھن راستے 'پگ = پیر ہاؤں 'کائیاں = کانٹے' باگھ = شیر ' ٹھیاوں = جگہ پہاڑ ' بن کھنڈ = جنگلوں 'اوتارن ہار = اتارنے والا۔

اب اس نظم کا جو ترجمہ کتاب "تاریخ برہان پور" کے فاضل مصنف حضرت مولوی معین الدین ندوی برہان

پوری مرحوم [متوفی ۱۹دسمبر ۱۹۷۸ء مدفون احاطہ درگاہ شاہ عبداللہ سید ھی پورہ برہان پور] نے اپنی اس مذکورہ کتاب میں تحریر فرمایا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں:

ترجمہ: "وہ نجات دلانے والا [خدا] سب باتوں کی حفاظت کرنے والا ہے۔ وہی دشوار گھائیوں سے پار اتارنے والا ہے [اے میرے خدا!] میرے سامنے خوف ناک پہاڑ ہے۔ جس میں شیر رہتے ہیں اور میرے پیر میں کانٹے چبھے ہوئے ہیں۔ سب جنگلوں کا تو ہی بادشاہ ہے جو مری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ میں تیرے قربان جاؤں۔ اب اس کے ساتھ وہ تشریح بھی ملاحظہ فرمائیں جو مولوی صاحب موصوف نے تحریر فرمائی ہے۔

تشریح: "حضرت بہاؤالدین باجن نے اپنے نا قابلِ حل مشکلات کو تمثیل کے پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ میں شیروں سے بھرے پہاڑ میں اس حالت میں گھر گیا ہوں کہ میرے پیروں میں کانٹے چبھے ہیں جن کی وجہ سے میں بھاگ کر جان بھی نہیں بچا سکتا۔"

اس تمثیل کو دوبارہ غور سے پڑھئے۔ پھر اس حالت کا اچھی طرح احساس کیجئے جو اس تمثیل سے نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ تبھی آپ کو اس نظم کے بے پناہ تاثر کا اندازہ ہو گا۔

اس تشریح کو تحریر فرمانے کے بعد مولوی صاحبِ موصوف آگے لکھتے ہیں کہ اس مفہوم کو حضرت خواجہ حافظ شیرازی [متوفی ۷۹۱ھ ایران] نے اس طرح ادا کیا ہے۔

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چناں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

یعنی دریا کے کنارے رہنے والوں کو ہماری اس بے بسی کی حالت کی کیا خبر کہ ہماری کشتی اندھیری رات میں طوفانی لہروں اور خوف ناک بھنور میں گھری ہوئی ہے۔ جہاں تک اپنی بے بسی کی تصویر کشی کا تعلق ہے دونوں برابر ہیں۔ لیکن حضرت بہاؤالدین باجن نے اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے اللہ کی شانِ رحمت پر اعتمادِ کامل کا اظہار بھی کیا ہے۔ جب کہ خواجہ حافظ شیرازیؒ کے شعر میں اس کا اشارہ تک نہیں ہے۔ اس لحاظ سے شاہ بہاؤالدین باجن کا مضمون خواجہ حافظؒ کے مضمون سے بڑھ کر ہے۔" [۴۵ تا ۴۷] مذکورہ تشریح کو لکھتے وقت فارسی زبان کے عظیم شاعر حضرت خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کا اسمِ مبارک جو زبان تک آ گیا تو میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں یہاں آپ کے [حافظ شیرازیؒ کے] اس عظیم المرتبت فرزند کا بھی کچھ ذکر کر دوں جو برہان پور دار السرور کی سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں۔ جی ہاں' یہ ایک حقیقت ہے کہ برہان پور دار السرور میں فارسی کے اس عظیم شاعر حافظ شیرازی کے فرزند حضرت شاہ نعمان چشتیؒ اپنی زندگی کے کئی عزیز سال گزارنے کے بعد یکم ربیع الاوّل ۸۸۱ھ\۱۴۷۶ء میں واصلِ حق ہوئے اور یہیں کی سرزمین میں آپ مدفون ہیں۔ برہان پور

میں آپ کی درگاہ' آج بھی مرجع خلایق بنی ہوئی ہے۔ جسے اسیر گڑھ کہا جاتا ہے۔
حضرت شاہ نعمان چشتی کے سلسلۂ نسب کے تعلق سے تذکروں کی کئی مشہور اور معتبر کتابوں میں تفصیل سے لکھا ہے ایک حوالہ ملاحظہ فرمائیں:
''شاہ نعمان چشتی فرزند حضرت خاجہ شمس الدین حافظ ابنِ خواجہ نور الدین ان خواجہ شرف الدین ابن خواجہ محمد زاہد اور زاولاد سے حضرت خواجہ مودود چشتی علیہ الرحمتہ کے ہیں۔'' [تاریخ برہان پور صفحہ ۱۱۷]
حضرت شاہ نعمانؒ کی ولدیت کی تصدیق مشہور زمانہ کتاب ''شعر العجم'' سے بھی ہوتی ہے۔ جو مشہور عالم علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی معرکتہ الاراء تصنیف ہے اس میں علامہ موصوف نے اپنے دلکش انداز میں صاف طور پر لکھا ہے کہ ''خواجہ حافظ [حافظ شیرازی] کی آزاد مزاجی اور رندی سے قیاس ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کے بکھیڑوں سے آزاد ہوں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ شادی بھی کی تھی اور اولاد بھی تھی۔ صاحبزادے کا نام شاہ نعمان تھا وہ ہندوستان میں آئے اور یہیں بمقام برہان پور وفات کی۔ ان کی قبر قلعہ اُسیر کے متصل ہے۔'' [شعر العجم حصہ دوم صفحہ نمبر ۲۰۲ مطبع معارف اعظم گڑھ یو۔ پی۔ ۱۹۴۷ء] یہ بات علامہ موصوف نے غلام علی آزاد بلگرامی کی مشہور تصنیف ''خزانۂ عامرہ'' اور ''مراۃ الصفا'' کے حوالے سے تحریر فرمائی ہے۔ شہرۂ آفاق تصنیف گلزار الابرار'' کے مصنف ملا محمد حسن غوثی مانڈوی نے تقریباً ۱۰۲۰ھ میں آپ کے [شاہ نعمان کے] چشتی اسیر برہان پوری کے عرس میں شرکت کی تھی اور اس کی تفصیل مذکورہ تصنیف میں لکھی ہے [گلزار الابرار ورق ۱۳۹' ازکار ابر نمبر ۱۹۷'' تاریخ برہان پور طبع اوّل نمبر ۹۳ طبع ثانی نمبر ۱۲۰] ''گلزار الابرار'' کا اردو ترجمہ ''اذکار ابرار کے نام سے آگرہ میں ۱۳۲۸ھ ۔ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا ہے۔ [تفصیل کے لئے راقم کا مضمون ''حضرت نعمان چشتی اسیری'' ملاحظہ فرمایئے۔] ابھی آپ نے حضرت شاہ باجنؒ کی نظم اور اس کی تشریح ملاحظہ فرمائی ہے مذکورہ نظم کو ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے اپنی کتاب ''شاہ بہاؤ الدین باجن'' میں صفحہ ۹۸ پر اور پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اپنی گراں قدر تصنیف ''مقالاتِ شیرانی'' میں صفحہ ۲۷ پر درج کیا ہے اور شاہ باجن کے ملفوظات ''خزانۂ رحمت'' کے نسخہ برہان پور میں یہ مذکورہ نظم صفحہ ۳۱۰ پر لکھی ہوئی ہے۔ ان کے فرق کو واضح کرنے کے لئے ملفوظات میں درج نظم کو میں یہاں دوبارہ لکھ رہا ہوں۔

میرا اتروی نے رے سب باتوں کار کھوال

اوگھٹ گھاٹ اوتارن ہار!

بکٹ ڈونگر ہور پک میں کائیاں باگھ بے جس بٹھاؤں

سب بن کھنڈ کا توہی راجا' تیری واری جاؤں

گھر آنگن باہر توں ہیں رکھوالا نگہ واں تیرا ناتوں

حضرت شاہ باجن کے کلام کی صوری ہیئت اپنی نوعیت کی الگ قسم کی ہے۔ جسے ہم گیت کی ایک شکل کہہ سکتے ہیں جس طرح گیت میں باوزن فقرے ہوتے ہیں اور انھیں سروں میں موسیقی کے ساتھ گایا جاسکتا ہے اسی طرح حضرت بہاؤالدین باجن علیہ الرحمتہ کے کلام کی صوری ہیئت کو گیت کی شکل دی ہے۔ آپ نے اپنے کلام میں با وزن فقرے ایسے موزوں کئے ہیں جنھیں سروں میں موسیقی کے ساتھ گایا جاسکتا ہے۔

حضرت شاہ باجن کا مشرب 'مشرب چشتیہ تھا۔ یعنی وہ سلسلۂ چشتیہ سے تھے۔ جن کا صوفیائی سلسلہ سلطان المشائخ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری [غریب نواز' وصال رجب المرجب ۶۳۲ھ] سے ملتا ہے۔

صوفیہ کے اس مشہور و معروف سلسلے میں موسیقی اور شعر و شاعری کلی طور پر جائز ہے۔ حضرت شاہ بہاؤالدین باجن اس سلسلۂ چشتیہ کے ایک باعمل صوفی بزرگ تھے۔ جو اپنے سلسلے کے صوفیائے کرام کے نقشِ قدم پر چلنا اپنا فرضِ اوّلیں سمجھتے تھے۔ آپ جس بات یا چیز کو بھی اپنے مسلک اور مشرب کے مطابق صحیح' درست اور جائز سمجھتے اس پر خود بھی عمل پیرا ہوتے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ہدایت و تلقین فرمایا کرتے تھے اس لئے آپ کو اپنے مسلک اور مشرب کے مطابق موسیقی اور شعر و شاعری سے نہ صرف یہ کہ گہرا لگاؤ اور شغف تھا بلکہ آپ کو فنِ موسیقی اور فنِ شعر و شاعری کی واقفیت بھی تھی۔ اور آپ راگ راگنیوں کو بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت رحمت اللہ [متوفی ۸۶۷ھ یا ۸۷۷ھ مزار شریف کنارے سابر متی احمد آباد گجرات ابنِ حضرت عزیز اللہ متوکل مزار مانڈو' دھار] کو موسیقی اور شعر و شاعری میں لدچسپی اور حصہ لیتے بھ دیکھا تھا۔ اس لئے آپ بھی ان کی طرح شروع سے شاگردی اور مریدی سے ان چیزوں میں عملی طور پر حصہ لیتے تھے۔ آپ بھی اپنے مذکورہ پیر و مرشد کی طرح اوقات یادِ الٰہی کے بعد موسیقی بھی سنتے تھے اور جب جی چاہتا تو اپنے دلی جذبات کے لئے باوزن فقروں کو ملا کر شاعری بھی کرتے تھے۔ اور اپنے کہے ہوئے گیتوں کو راگ راگنیوں کی طرز پر سُروں میں گنگنا کر اپنے مریدوں اور عقیدمندوں کو سنایا کرتے تھے۔ پھر یہ گیت خوش گفتار قوالوں تک پہنچ جاتے اور وہ انھیں مجلسوں میں پیش بھی کرتے تھے۔

آپ کے [شاہ باجن کے] کے یہ گیت خالقِ مطلق کی وحدانیت اور یگانگت کو ظاہر کرنے کے لئے حمد کی صورت میں بھی ہوتے تھے۔ اور حضور اکرم ﷺ کی نعت کی صورت میں بھی کہے جاتے تھے۔ اور اپنے پیر و مرشد کی تعریف و توصیف اور روحانی بزرگوں کی عقیدت میں بھی بنائے جاتے تھے۔ ہر زمانے کی طرح اس زمانے میں میں بھی [یعنی نویں صدی ہجری میں] نثر کے مقابلے میں شاعری زیادہ اثر انگیز تھی۔ اس لئے آپ بھی اپنے دلی جذبات ۔۔ متاثر کرنے والی شاعری میں ظاہر کرنے لگے۔ پروردگار نے آپ کو شاعرانہ طبعیت بڑی فیاضی کے

ساتھ عطا کی تھی اس لئے آپ کو شاعری کی مختلف صنفوں گیت' دوہرے' غزل' نظم وغیرہ میں اشعار کہنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ اس طرح آپ کا وہ کلام بتدریج ترتیب پاتا چلا گیا جو آپ کے قلمی ملفوظات "خزانۂ رحمت" میں موجود اور محفوظ ہے۔

روزے دھر دھر نماز گذاری دینی فرض زکوٰۃ
بن فضل ترے جھوٹک ناہیں آگیں مکھن بات

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی مرحوم کا ایسا کہنا کہ آپ کے [شاہ باجن کے] کے کلام میں ہمیں دوہے ملتے ہیں' جو ہندی کے اثر کا نمونہ ہیں' آپ نے ہندی کو اپنایا تو اس کے معیاروں کو کام میں لایا گیا۔[۷۷]
اسی کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ شاہ باجن کے یہاں جو دوہے ملتے ہیں وہ بھی تقریباً اسی ہندی میں ہے جو اس وقت رائج تھی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے حضرت شاہ باجن علیہ الرحمۃ کے مندرجہ ذیل دوہے تحریر فرمائے ہیں:

باجن جیو امر ہے موا کھو کوئے
جے موا کہے وہی سودا ہوہے
روزے دھر دھر نماز گذاری دینی فرض زکوٰۃ
بن فضل تیرے چھوٹک ناہیں آگیں یکھیں بات

دوسرے دوہے کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے: اس "دوہے میں غیر زبان کے الفاظ اور مذہبی اصطلاحوں کا استعمال غور طلب ہے یہ دوہا اس دور کے بدلتے ہوئے رجحان اور غیر زبان کی ملاوٹ کا غماز ہے۔" [۷۷]
اسی کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب موصوف کا شاہ باجن کے کام کے تعلق سے یہ بھی کہنا ہے کہ آپ [شاہ باجن] کہ کلام میں ہمیں نظم کی ایک خاص قسم ملتی ہے۔ جس میں پہلا بند عقدہ ہوتا ہے اس کے بعد تین چار شعر کا بند ہوتا ہے اسے بین کہا جاتا ہے۔ اور آخری بند تخلص کا ہوتا ہے۔"

اسی بات کے پیشِ نظر ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے اپنی کتاب "شاہ بہاؤالدین باجن" میں شاہ باجن کے کلام کی صوری ہئیت کی تفصیل تحریر فرمائی ہے جو اس طرح ہے: "ہئیت کے اعتبار سے یہ گیت کی ایک شکل ہے اس میں دوہرے استعمال کئے گئے ہیں۔ کسی بول کے پہلے شعر ہم قافیہ باندھے جاتے ہیں انکو عقدہ کہا جاتا ہے۔ عقدہ کے بعد بند ہوتے ہیں ان میں تین یا چار مصرعے ہوتے ہیں ان کو بین کہا جاتا ہے۔ آخری بند میں عموماً تین مصرعے ہوتے ہیں ان کو تخلص کہا جاتا ہے۔

مخطوط ["خزانۂ رحمت"] میں یہ تقسیم ہر جگہ برابر نہیں ہے۔ کہیں عقدہ لکھا ہے تو بین نہیں لکھا اور بین لکھا ہے تو

تخلّص نہیں لکھا ہے۔
پردہ لوری کی ایک مثل ملاحظہ کیجئے:

بہر پور اول سہی تہانوں
بن بن کند کند گانویں گانوں

بین:

اس پریم تہے بن بنامائی مانی میل کرے
بہتیر بہتیر آگ جو دے جامن لاگے پون بہری

تخلص:

باجن تجکوں کیوں رے بکھانے
تیرے بکھانوں توں ہیں جانے
چوری چوری کہا نہ کرے
ایسی کرنی کون کرے

[۳۲۔۳۳]

اسی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:
"قول پروفیسر شیرانی "نظم کی تقسیم "صوبہ گجرات میں دیر تک رہی۔" [مقالات جلد ۱۵۶]
آگے چل کر ڈاکٹر صاحب موصوف نے شاہ باجن کے کلام کے تعلق سے اپنی یہ گراں قدر رئے بھی ظاہر کی ہے کہ:
"باجن پہلے شخص ہیں جنہوں نے غنائی شاعری عام اور مقبول بنایا ہے۔ ان کی شاعری پر ہندی خدو خال میں تصفف کی گہری چھاپ تھی۔" اور
باجن ے اپنے کلام کو مختلف راگ راگنیوں کے تحت لکھا ہے مثلاً پردۂ صبا' للت' بھوپای' بھیروں' بلاول' توری' مارو' کلیان۔

پردہ کلیاں کی جگری دیکھئے:

پیو پیو پیو بہر بہر پیو
تجھ سنہ رانا میرا جیو

بین

سیہ جگ تجہ مکہ دیکیں جاوے

جو دیکھے سو وہ سدھ گنواوی

نینوں مسیتی مدور پلاوی

تخلص

باجن کا توں آہے پیو

تجہ پر وار یا باجن جیو

حضرت شاہ باجن کے قلمی ملفوظات "خزانۂ رحمت" کے خزانۂ ہفتم میں آپ کا [شاہ باجن کا] جو کلام بزبانِ ہندوی اور گوجروی درج کیا ہوا ایک جگہ دیکھنے کو ملتا ہے اسے ڈاکٹر صاحب موصوف [شیخ فرید مرحوم] نے اپنی مذکورہ کتاب "شاہ بہاؤالدین باجن" میں اوّل تا آخر درج کیا ہے۔

شاہ باجن نے اپنے کلام کو جن مختلف راگ راگنیوں کے تحت لکھا ہے ان کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے الگ الگ لکھتے ان کے تحت حضرت شاہ باجن کے کلام کو بخوبی سمجھنے میں بڑی سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے شاہ باجن کا دیگر کلام بھی "انتخابِ کلامِ باجن" کے عنوان سے درج کیا ہے۔ آخر میں شاہ باجن کی ایک مثنوی بعنوان "جنگ نامہ" درج کی ہے۔

حضرت شاہ باجن علیہ الرحمتہ نے مختلف راگ راگنیوں کے تحت جن پردہوں میں یہ عقیدے کہے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

پردہ صباحی میں [۸] 'پردۂ توری میں [۷] 'پردۂ کیدارا یا کیدارا میں [۶] پردہ ملہار میں [۶] 'پردۂ مارو میں [۳] 'پردۂ بھیروں میں [۳] 'پردۂ دہنا سری میں [۲] 'پردۂ سندھوا میں [۲] 'پردۂ فارو دنہا میں [۲] 'میں [۳] پردۂ بھیروں میں [۲] پردۂ دہنا سری میں [۲] پردۂ سندھوا میں [۲] پردۂ فار دنہا کسری میں [۲] پردۂ کانہرہ میں [۲] 'پردۂ مالکوس میں [۲] 'پردۂ سوبہی بھوپال میں [۱] 'پردۂ للت میں [۱] 'پردۂ بلاول میں [۱] 'پردۂ کلیان میں [۱] 'پردۂ سوئی میں [۱] پردۂ رام کلی میں [۱] 'پردۂ گوری میں [۱] 'پردۂ بین میں [۱] 'ایسے کل ۵۱ عقدے حضرت شاہ باجن نے ہندی اور گوجری زبانوں میں کہے ہیں۔

حضرت شاہ باجن جس دور میں [یعنی نویں صدی ہجری میں] اپنے دلی جذبات کے اظہار کیلئے ہندی' فارسی اور گوجری زبانوں کے باوزن فقروں کو جوڑ کر جوگنگا جمنی شاعری کر رہے تھے۔ اسکو اچھی طرح ذہن نشین کئے بغیر آپ کی شاعری کو اور آپ کے ادبی کارناموں کو سمجھنا بہت مشکل ہی نہیں' میرے نزدیک بہت دشوار بھی ہے۔

اس دور میں ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح گجرات [جہاں حضرت باجن نے اپنی شروع زندگی کے کئی عزیز سال گزارے ہیں۔] اور برہان پور میں [جہاں حضرت شاہ باجن نے اپنی آخری زندگی کے تقریباً چالیس عزیز سال گزارے ہیں] یہاں کی مقامی بولیں اور رائج زبانوں کے عنصر دیگر زبانوں کے عنصر کے ساتھ اختلاط سے ایک مخلوط بولی وجود میں آگئی تھی۔ لیکن اس مخلوط بولی نے ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد بھی ابھی تک ایک نئی زبان [اردو زبان] کا روپ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے دیگر علاقوں کے اولیاء کرام کی طرح روحانی بزرگ حضرت شاہ بہاؤالدین باجن نے بھی 'جن کی مادری زبان فارسی تھی' علاقائی رائج الوقت زبانیں [ہندی اور گوجری] اپنے خیالات کے لئے نہ صرف سیکھ لی تھیں بلکہ کہنا چاہئے کہ انھیں دل سے اپنا بھی لیا تھا۔ اور جب آپ نے صوفیانہ زندگی اختیار کی تو آپ نے اپنے مذہبی فرائض [عبادت کو چھوڑ کر] کی ادائیگی خاص طور پر درس و تدریس اور رشد و ہدایت میں مذکورہ مخلوط بولی کو زیادہ تر استعمال کرنا شروع کیا۔ آپ اس زمانے کے صوفیا خانوادے کے ایک اہم فرد ہی نہیں بلکہ روحانی بزرگ بھی تھے۔ اس لئے آپ نے مذہبی مقاصد کی تکمیل کے لئے شاعری کا دامن تھاما۔ کیوں کہ اس زمانے میں نثر کی بہ نسبت شاعری عوام میں بہت مقبول ہو جاتی تھی۔ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر کے آپ نے شاعری کی مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی۔ مگر اس کے بعد بھی آپ کی شاعرانہ طبیعت کی سیری نہ ہوئی۔ اور آپ شاعری میں کوئی نئی بات پیدا کرنے کے لئے بے چین رہنے لگے۔ اس وقت تک گجرات اور برہان پور میں 'جو کہ فاروقیہ سلطنت کا دارالخلافہ تھا' کوئی ادبی کارنامہ منظر عام پر [بحر الفصاحت کو چھوڑ کر] نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی کوئی ادبی نمونہ آپ کے پیش نظر تھا جس سے استفادہ کر کے آپ شاعری میں کوئی نئی راہ نکالتے۔ اس لئے آپ نے اپنی شاعرانہ طبیعت سے مجبور ہو کر ہندی' فارسی اور گوجری زبانوں کے فقروں کو جوڑ کر گنگا جمنی شاعری کی راہ بنائی۔ شروع شروع میں آپ کو اپنی شاعرانہ طبیعت کے مطابق شاعری کرنے میں کئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ اس وقت تک زبان و ادب کے کوئی قاعدے اور صرف و نحو کے کوئی ضابطے اور اصول نہیں بنائے گئے تھے۔ جن کی آپ پیروی اور پابندی کرتے اس لئے آپ نے اپنے مزاج اور طبیعت پیروی اور پابندی کرنا پسند فرمایا۔ اور طبع آزمائی کرتے کرتے آپ نے اپنی شاعری میں ایسی ایسی جدتیں پیدا کیں جس نے آگے چل کر نہ صرف یہ کہ ریختہ کے لئے راہیں ہموار کیں بلکہ ایک نئی زبان 'ہم سب کی عزیز اور پیاری زبان اردو کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوئیں۔

حضرت شاہ باجن کی اس مذکورہ شاعری کو ادبی نمونہ اور کارنامہ بنے ہوئے قریب چھ سو سال ہو گئے ہیں۔

تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی مخلوط بولی نے اپنی سماجی حیثیت سے بڑھ کر مغل شہنشاہ شہاب الدین شاہجہاں [۱۶۲۸ء۔ ۱۶۵۸ء] میں ایک نئی زبان کی شکل اختیار کی۔ اور اس کا نام "اردو

قرار پایا۔ پھر آگے چل کر اس دلکش اور پیاری زبان میں شاعری بھی ہونے لگی۔ پھر تو یہ زبان اتنی پھلی پھولی کہ یہ بہت جلد ایک مکمل اور مبسوط اور وسیع زبان بن گئی۔

اردو شاعری نے پچھلے ساڑے تین سو برسوں میں جا جواب اور شاندار ترقی کی منزلیں طے کی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر کر کے صرف اتنا لکھنا چاہتا ہوں کہ آج کی ہماری اردو شاعری کی بلاغت و فصاحت اور تمازت و مقبولیت وغیرہ سبھی باتیں قابل تسلیم ہیں۔ لیکن آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے حضرت شاہ باجن علیہ الرحمتہ نے جو شاعری کی اسکی بھی اپنی جگہ اہمیت اور قدر و منزلت ہے۔ اس کی اسی اہمیت اور قدر و منزلت کے پیش نظر ڈاکٹر مدنی مرحوم نے اس کے تعلق سے تحریر فرمایا ہے کہ:

"اس لحاظ سے آپ کا [شاہ باجن کا] کا کلام اس دور کی بولی کی اہم تحریر شہادت ہے۔"

اسی زمانے [یعنی پندرہویں صدی عیسوی] کی "اہم تحریری شہادت" یعنی شاہ باجن کے کلام کو سمجھنے کے لئے اس زمانے کی بعض اہم خصوصیات کو سمجھنا نہایت ضروری ہے جو ڈاکٹر مدنی مرحوم نے اپنی کتاب "سخنورانِ گجرات" میں تفصیل کے ساتھ تحریر فرمائی ہیں۔ ان لسانی خصوصیات کو پیش نظر رکھنے سے حضرت شاہ باجن کے ہندی اور گجروی کلام کو سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہوگی۔ اس خیال سے میں ان لسانی خصوصیات کو قبلہ مدنی مرحوم کے ہی لفظوں میں یہاں لکھ رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے:

نمبر ۱: گجراتی الفاظ کا استعمال [مندرجہ ذیل الفاظ اور بعض خصوصیات راجستھانی اور دوسری زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں]

جوئے = دیکھے 'سیری = کوچہ 'ایولے = ایسے 'لیکھے = سمجھے 'دیٹھا = دیکھا 'ساتھے = ساتھ 'سادہ = آواز 'ٹھولیا = ڈھونڈا 'آفون = آنڈوں = لاؤں 'ایہاں = یہاں 'اون = لذت [ساکن کو بھی کہتے ہیں]

نمبر ۲: ضمیروں کی قدیم شکلیں [گجراتی میں بھی یہی استعمال ہوتی ہیں]

ہوں بمعنی میں 'تمہ بمعنی تم 'جیھنے بمعنی جس نے میں یعنی تونے گجراتی۔

نمبر ۳: بعض جگہ صیغہ ماضی بنانے کے لئے گجراتی قاعدکی پیروی کی گئی ہے گجراتی میں ماضی بنانے کا کلیہ طریقہ ہے کہ مصدر میں آخری حرف سے قبل حرف کو "ی" سے بدل دیا جاتا ہے۔ جیسے دیکھنا کا گجراتی جوؤں اور اس کا ماضی جوؤں ہوگا۔ اور ماضی دیکھیا۔ اسی طرح دھروں یا پوچھوں کا ماضی دھریا اور پوچھیا ہے۔ آگے چل کر یہی دھرا اور پوچھا ہو گئے۔ کہنا = کہوں اس کا ماضی لہیا 'لہیوں اور آگے چل کر کہا ہو گیا۔

نمبر ۴: بعض جگہ نے کی جگہ لے استعمال کی گئی ہے جیسے محمود نے کی بجائے محمود لے یا محمودیں سے کے لئے تھی یا تھے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً:

جسے دیکھ اس تھے بھاگے = یہ نیلچ ان سنہ لاگے [گجراتی میں سے کے لئے تھے ہاتھی مستعمل ہے میں [اندر] کے لئے گجراتی منہ ماں کا استعمال کیا جاتا ہے [نے] کے لئے [لے] گجراتی میں بھی مستعمل ہے
نمبر ۵: مستقبل سی سے بنانے کی ترکیب گجراتی کے علاوہ کئی زبانوں میں ہے۔ مثلاً کریسوں 'دیسوں وغیرہ بمعنی کریں گے 'دیں گے۔

ارے رائے کا سانڈہ او تالے ھانگ = پچھیں مار گے رہیں تھاگ

یہ جیو دلیوں یہ جیو دیسوں = سبہ ہر لہر تھ سوں بھوک کرسیوں

الفاظ کی جمع بنانے کے دو طریقے پائے جاتے ہیں 'ایک برج [بھاشا] کے مطابق 'جیسے راتیں = راتنہ' تیغیں = تیغنہ 'درویشوں = درویشنہ 'اور ان یایان لفظ کے آگے بڑھا کر بھی جمع بنائی گئی ہے۔ جیسے سیری سے سیریاں 'آنکھ سے آنکھیاں لوگ سے لوگاں یالوکا۔
نمبر ۷: جمع مضارع = کریں 'دھریں 'بھگیں 'مانگیں 'مانگیں کے لئے برج کی ترکیب پر کرنہ 'دھرنہ 'بھاگنہ 'مانگنہ عام طور پر پایا جاتا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ کریں 'دھریں کی املا کرنہ 'دھرنہ ہو [کرنہ میں نون غنہ پڑھا جائے۔]
نمبر ۸: بعض الفاظ اس طرح بولے جاتے تھے:

اہے = ہے 'منجہ = مجھ 'چکہ اور کچہ = کچھ 'ایہی = یہی 'جہ = جب 'سبہ = سب 'ہب = اب وغیرہ۔
نمبر ۹: بعض فارسی الفاظ کا تلفظ اور لہجہ یہ ہے:

نگھواں = نگہباں 'درس = درست' آرس = عروس' زلیچہ = غالیچہ' نسخا = نسخہ' صحی = صحیح' رازی = راضی' مسیت = مسجد 'بندا = بندہ 'مصرے = مصرعے 'ذہنی = ذہنی وغیرہ۔
نمبر ۱۰: ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اکثر فارسی محاوروں کا اردو میں ترجمہ کر لیا گیا ہے۔ ممکن ہے عام بولی میں ایسے ترجمے پہلے ہی سے موجود ہوں اور جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی نئے نئے محاورے اردو میں منتقل ہوتے گئے۔ یہ خصوصیت ادب کے ہر دور میں پائی جاتی ہے۔ ولیؔ [دکنی یا گجراتی] کے ہاں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے بلکہ غالبؔ 'مومنؔ اور اقبالؔ نے ترجمہ کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں بھی بنائی ہیں۔ قدیم عہد کی چند مثالیں دیکھئے:
دفن کردن سے دب کردن 'محبت داشتن سے پیار دھرنا 'روزہ داشتن سے روزہ دھرنا 'رقص سے رقصے 'نوختن سے نوازے وغیرہ۔
نمبر ۱۱: فارسی کی واؤ عطف کی جگہ ضحہ سے کام لیا گیا ہے۔ جیسے ارض و سما کو ارض سما۔ ان بزرگوں کے کلام میں لفظ کے املا کے لئے کوئی ضابطہ نہیں پایا جاتا مثلاً چ کے لئے ایک ہی نقطہ لگایا جاتا ہے۔ ژ کو رلکھتے ہیں جھ کو جہ لکھتے ہیں اور کسی جگہ چار نقطوں سے حرف بناتے ہیں۔ مٹھی کو موٹی لکھا ہے۔ صوفیاء نے شعر گوئی کو ادبی نقطہ نظر

سے نہیں اختیار کیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے ہاں تلفظ اور املا کا کوئی التزام نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے اپنا پیغام رائج الوقت بولی میں دوسروں تک پہنچایا۔ اس طرح بولی نے زبان کی شکل اختیار کرلی۔[۹۷ تا ۸۱]۔ اب آپ حضرات حضرت موصوف کا وہ گراں قدر کلام ملاحظہ فرمائیں جو آپ کے قلمی ملفوظات "خزانۂ رحمت" کے مختلف صفحات باغ میں پھیلے ہوئے خوشنما پھولوں کی طرح بکھرا ہوا بھی ہے۔ اور "خزانۂ رحمت" کے "خزانۂ ہفتم" میں مجموعہ کلام کی طرح ایک جگہ جمع بھی کردی گیا ہے۔ اسے ہم حضرت موصوف شاہ باجن کے کلام کا قدیم ترین تدوین کا مونہ کہہ سکتے ہیں۔
مذکورہ ملفوظات میں صفحہ پر حضرت موصوف شاہ باجن کی نظم درج ہے۔ وہ یہ ہے:

۱: سونا وپا بہر بدرے ہور بہتی دام = بہت بایاں کہہ خاصے مونا نام
۲: تجھ بن یہ جی مجھ ہی کہو نہ آوے کام = بہتر بابر پرے رے تجھ سو سب بسرم
۳: جی جیوا ہوئی پیو سوں مجھ تو ہی سب کچھ = بہی گھورے گہر برے مجھ تا نہیں اڑچ
۴: باجن کئی یہ بنسی شیخ رحمت اللہ پاؤں = تدہ جگ واری دنی کر ہو سرجن رایوں

اس نظم کو اپنی کتاب "سخنورانِ گجرات" میں درج کرتے ہوئے ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی مرحوم نے اسے نظم لکھا ہے اس لئے میں بھی حضرت موصوف شاہ باجن کے مذکورہ کلام کو نظم ہی لکھ رہا ہوں۔ حقیقت میں یہ نظم ہی ہے اس لئے اسے نظم لکھنا ہی درست اور صحیح ہے۔
ڈاکٹر صاحبِ موصوف نے اس نظم کو اپنی کتاب میں درج کرتے ہوئے گوجری زبان کے ان الفاظ کے معنی بھی لکھے ہیں جو مذکورہ نظم میں استعمال کئے گئے ہیں گوجری کے وہ مشکل الفاظ اس طرح ہیں:
بہتی = بہت سی' موجھی = مجھے' کچو = کچھ' بسرام = آرام' گھوڑے = گھوڑے' برے = بڑے' خاص بھی' نا نہیں = نہیں' اچ = دل بستی کی = کہی = کی' دنہ = دونوں' واردی = نثار کر کے۔
اس کے بعد ڈاکٹر صاحبِ موصوف نے حضرت شاہ باجن کی درج ذیل نظم لکھی ہے:

۱: یہ جو دیسوں یہ چپو دیسوں = نس دن تمسنہ بھوگ کریسوں
۲: یہ جیو پیارا منجہ تری تائیں = بہیت تماری گروں گسائیں
۳: باجن جیو تمہاری تائیں = جیو جیو ابے تو نہیں گسائیں

مشکل الفاظ = تیری تائیں = تیری وجہ سے' بہیت = بھینٹ' نذر' جیو جیو = رگ رگ میں' ابے = ہے' تو نہیں = تو ہی۔ حضرت شاہ باجن کی ایک نظم اور بھی درج کی ہے۔ جو یہ ہے:

۱: باجن تنکے ہو بلہاری جی دیہیاں دہنی کی لاگیں
۲: کہری کہری اور لہک جگاویں چہری پہری بنے جاگیں

۳ راجی کے دربار سی تت بہاری راتو نہ پہری پہری

۴ دن بن بیکھرو کرل کریں مندر مندر دیورے بلینہ

۵ آپی جاگیں اور ن بھی جگویں پہری پہری سبد سناویں

۶ النگ النگ بینہ میں چوکے رت جاگو لوگا جاتی رات

گوجری زبان کے مشکل الفاظ = تنکے =ان کو 'بلہاری= خوشی 'جی= جو' دہیان= دھیان 'کہری کہری= گھڑی گھڑی یا کھڑے کھڑے 'کبک جگاویں = شور و غل' پہری پہری= باری باری' بینے= بیٹھیں' راتونہ= رات بھر' بیکہرو= پکھیرو= پرندے' کرل= آوازیں' کرہانا' دیو= دیئے' بلینہ= جلیں' سبد= نیک باتیں' [شبدھ] 'النگ =الگ' بینہ ہیں= بیٹھیں' چوکیات= چوکہات= چوکیاں۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے حضرت شاہ باجن کے اشعار لکھے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں شریعت' طریقت اور حقیقت کو سمجھایا گیا ہے۔ اس پر لفظ گوجری لکھا ہوا ہے۔

جی توں آہی بد کارو

اوڑھنا دیکھ پسارے پاؤ

شریعت کی تو وہ بات نچوڑ

جے تجہ جنم نہ لاگے کہور

طریقت اہے اپنے نبی کا فعل

بکھیں بات نہ اہے کھیل

حقیقت دریا اہے بے کنار

بھوت ڈوبے کچھ اترے پار

گوجری کے الفاظ اہے= ہے' بد کارو =بد کار' اوڑھنا= اوڑھنا= چادر' جے =جو' کہو= گھوڑ= عیب' بکھیں= کہیں' بھوت= بہت۔

حضرت شاہ باجن کی اس مذکورہ نظم کو درج کرنے سے پہلے کتاب "تاریخ اولیائے کرام برہان پور" کے مؤلف بشیر محمد خان ایڈوکیٹ مرحوم نے "خزانہ رحمت" کی عبارت [فارسی میں] کا ترجمہ بھی لکھا ہے۔ جو اس طرح ہے: "شریعت مثل کشتی' طریقت مثل ملاح' معرفت بادبان اور حقیقت مثل دریا ہے۔ پہلے کشتی کو استوار کرو پھر اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اور پھر طریقت کا ہاتھ پکڑو اور بادبان معرفت کو اٹھاؤ اور دریائے حقیقت میں چلو جب تک کہ کشتی شریعت و ملاح طریقت و بادبان' معرفت یہ تینوں چیزیں حاصل نہ ہوں کشتی میں سوار نہ ہونا

اور نہ دریائے حقیقت نہ پاؤ گے۔اس پر آپ نے گوجری زبان میں کہا:

جی تون آہی بد کارو

اوژھنا دیکھ پسارے پاؤ

اوژھنا دیکھ پسارے پاؤ

شریعت کی تو وہ بات نچوڑ

بے تجہ جنم نہ ااگے کہور

طریقت اہے اپنے نبی کا فعل

بکھیں بات نہ اہے کھیل

حقیقت دریا اہے بے کنار

بھوت ڈوبے کچھ اترے پار[۸۶]

یہ نظم حضرت شاہ باجن کے قلمی ملفوظات [چھ سو سال پہلے کے] میں صفحہ نمبر ۳۲۴۔ ۳۲۳ پر درج ہیں۔ ایڈوکیٹ مرحوم نے اپنی اس گراں بہا کتاب میں ایک جگہ شریعت 'طریقت اور حقیقت کی تعریف اور وضاحت، لکھی ہے۔ جو عظیم المرتبت روحانی بزرگ اور ولیٔ کامل حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ [ولادت باسعادت ۶۵۴ شہر ہانسی یو۔پی۔وفات ۱۲ صفحہ ۳۸ ۷ھ ۱۳۳۸ ءیوم شنبہ مدفون اور درگاہ شریف خلد آباد مہاراشٹر بن شیخ محمد محمود] نے اپنے ملفوظات میں بیان فرمائے ہیں۔اس تعریف ووضاحت کو بھی میں قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لئے یہاں اس خیال سے لکھ رہا ہوں کہ اس سے قارئین کرام کو حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کی مذکورہ نظم سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہو گی۔وہ تعریف ووضاحت یہ ہے:

''شریعت 'طریقت اور حقیقت امر ونہ کا پابند ہونا شریعت ہے۔دل کی صفائی کرنا اور برائیوں کو اچھائیوں سے بدل دینا طریقت ہے۔اور ماسوااللہ کی باتوں کو دفع کر کے روح مس تجلی پیدا کرنا حقیقت ہے۔'' [۳۳]

مذکورہ اشعار کے بعد ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی مرحوم نے اپنی کتاب ''سخن وران گجرات'' میں حضرت شاہ باجن کے کچھ اور اشعار لکھے ہیں جو موصوف ڈاکٹر صاحب نے ''خزانۂ رحمت'' کے اس نسخہ کے پیش نظر لکھے ہیں 'جو نسخہ برہان پور کہلاتا ہے۔جو برہان پور دارالسرور میں چھ سو سال بعد موجود و محفوظ ہے۔وہ اشعار یہ ہیں:

جہت مت کھیلت چچ مچ ہوئی

چچ مچ کھیلے بدا ہوئی

باجن ساجن ولے نرھی

جو نہ لینہ چھپانہ

جب ساجی اگنہ ہو جلنہ

جھوٹ چھوڑ ست جا نہ

گوجری کے مشکل الفاظ: برا = شاذ و نادر، جو نہ = یدکھنا، لینہ = لینا، چھپانہ = چھانہ، ساجی = ساجی، اگنہ = اگن = محبت کی آگ، جلنہ = جلیں، جانہ = جائیں۔

جب راوت جانو جھو جھیں باجن تب تو اکھو جائیں

جھ جھ کریا ہور نہ تب ہوئی پاچھیں آئیں

مشکل الفاظ گوجری زبان کے: راوت = سپاہی، جانو = جاتے ہیں، جھو جھیں = جنگ پر، اکھو = آگھو = آگے، یا ہور نہ = باہوریں = واپس آئیں، پاچھیں = باچھیں = پیچھے۔

ایڈوکیٹ بشیر محمد خان مرحوم نے حضرت شاہ باجن کی اس نظم کو اپنی کتاب "تاریخِ اولیائے کرام برہان پور" میں درج کرتے ہوئے لفظ "صوفی" کی بڑی اچھی تعریف لکھی ہے۔ جس سے حضرت شاہ باجن کی مذکورہ نظم کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اس لئے میں اسے یہاں لکھ رہا ہوں:

"لفظ صوفی" کے معنی جو صوف اور گلیم پہنتا ہو اس کو صوفی کہتے ہیں۔ ایک معنی یہ بھی ہیں کہ سلطان المرسلین کے عہد میں ایک صفہ [چبوترہ] تھا اس پر صفہ اصحاب رسول علیہ السلام میں سے چار سو اشخاص عبادت میں مشغول رہتے تھے اور اس جگہ قیام کرتے اور زندگی بسر کرتے تھے اور ان کو صفہ کہا جاتا تھا اور مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت آنحضرتؐ کے پاس نہیں جاتے تھے اور آنحضرتؐ ان کا حصہ اسی جگہ پہنچا دیتے تھے۔ وہ دِن رات عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور کبھی کبھی اپنی تربیت اور ارشاد کے لئے پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں جاتے تھے وہ فرماتے تھے کہ وہ اپنے کام میں مصروف رہیں۔ اور آنحضرتؐ ان کو صوفی کہتے تھے۔ جب کبھی سلاطن السیف [اپنے دفاع کے لئے] جہاد کے لئے جاتے تھے تو اصحابِ صفہ اس جگہ پہلے پہنچ جاتے اور قتل و غارت کرنا شروع کر دیتے تھے۔ پیغمبر علیہ السلامؑ میدانِ جنگ میں پہنچتے تو احباب پوچھتے کہ یہ لوگ کون ہیں تو فرماتے تھے کہ اصحاب صفہ ہیں۔ اور لشکر کی واپسی کے وقت وہ آپؐ کے پیچھے پیچھے آتے اور پھر اپنے چبوترے پر چلے جاتے تھے۔

حضرت باجن نے اسی کو ہندی میں کہا ہے۔ بیت:

جب راوت جانو جھو جھیں باجنب تو اکھو جائیں

جھ جھ کریا ہور تب ہوئی پا چھیں آئیں

[۸۳-۸۲]

جب راوت جانو جھو جھیں باجنب تو اکھو جائیں
جھ جھ کریا ہر نہ تب ہوئی پا چھیں آئیں

پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اس کو یوں نقل کیا ہے:

مناقبت ایشاں بزباں دہلوی گفتہ شدہ است
جب راوت جھو جھن جاونہ تب تو آگیں ہوا جائیں
جھو جھو کر باہر نہ [آونا] تب تو پچھیں ہور آئیں

[۱۳۳]

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی مرحوم نے اپنی کتاب میں حضرت شاہ باجن کے چند شعر اور لکھے ہیں، جو یہ ہیں:

باجن جی کس کے عیب ڈھانپے
اس تھی ور جن نہر نہر کانپے

نعمت علی ایسی ہی پائی
طیجا انکھیا جاری نکھائی

گوجری کے الفاظ: ور جن = شیطان = بدکار طیجا = مچا = میچ کر، جاری = چاڑی = چغلی

باجن خدا دعا اسی کی قبولے
اللہ اور جگ اس کا ہوئے
من مراد گھر سبھی پائی
تب اس مار سکی نہ کوئی

گوجری الفاظ: سی = سے گہر = گھر

باجن خدا اسی کی قبولے
کھائے حلال اور ساچ بولے

بشیر محمد خان ایڈوکیٹ مرحوم نے اسی کے ساتھ فارسی میں کہا گیا شعر بھی درج فرمایا ہے:

اجابت دعا را اپنا بد دو چیز
یکے لقمہ حل ودیگر صدق نیز [۸۷]

ے [باجن] محمد سرور بر مکان رحمت اللہ بہریا
باجن جیو را مار کرا کیں دہرایا

گوجری کے الفاظ: پرمکاں = پریم کا = محبت کا 'بھریا = بھرا ہوا' اکیں = آگیں = آ گے۔

باجن کوئی نہ جانے وہ کد تھا اور کد تھیں بر کف تہایا

اوہی جانیں آپ کون جن بعد جگ تھہ پایا

گوجری کے الفاظکد تھا = کہاں سے 'کد تھیں = کب سے 'برکت = پرگز = ظاہر

حضرت شاہ باجن ایک دوسرے دوہرے کی تشریح کرنے کے بعد مذکورہ ایڈوکیٹ نے آپ کے [شاہ باجن کے] دوہرے سے پہلے کچھ عبارت آرائی کی ہے۔

صوفی 'صوف سے ہے کیونکہ صوف سے صوفی نام پڑا ہے۔ یعنیہ شتر کا پشم ہے کہ اس کو دھنکتا ہے تو وہ مثل غبار کے ہو جاتا ہے۔ اس لئے جو کوئی محبتِ خدا میں مثل غبار کے ہو جائے اس کو صوفی کہتے ہیں۔ صفی کا کام وہ ہے کہ ہر آواز جو وہ سنتا ہے اس کو بر حق جانے کہ ہر شے اسی کا مظہر ہے ورنہ چوب رباب سے یہ راز اور ہر خشک لکڑی سے یہ فریاد و ناز کیسی ظاہر ہوتی؟ بیت:

اسرار حق تست کہ می خرد از رباب

ورنہ ز چوب خشک مرا این گماں بنود

حضرت سلطانِ صوفیاں حضرت نظام الدین اولیاء اپنے حال کے وقت یہ بیت پڑھا کرتے تھے ["خزانہ رحمت" صفحہ ۴۲۳ برہان پور نسخہ]

از کاسئہ رباب مرا نعمتی رسید

شد آفتاب ہر کہ از و ذرہ خشید

شاہ باجن نے فرمایا کہ بانسری کو نیزہ کی نے سے کاٹتے ہیں اور نے کے اندرونی حصہ کو آگ سے خالی کرتے ہیں اور سیخ کو آگ سے خالی کر کے بانسری میں سوراخ کرتے ہیں اور پھر بانسری کے ہر سوراخ سے فریاد نکلتی ہے اور نعرہ بلند ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ نعرہ صوفی کے دل میں سوراخ پیدا کر دیتا ہے۔ اسی پر حضرت شاہ باجن نے یہ دوہرا کہا ہے:

ایون باجن باجے باجن باجے رے اسرار چھا جھے

یہ پاوا شہ کا آوا ۱۱ ۱۱ان دستک دکھ کنواوا ۱۱۱

ہر کوں حق حق لاوا

یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ باجن کے معنی کیا ہیں؟ باجن کو زبان فارسی اور ہندی میں مزامیر یعنی بجنتر کہتے ہیں اور رباب کہ اس کو عاشق لوگ روحِ رباب کہتے ہیں آدمی کا وجود مندل کی صفت رکھتا ہے اور ہندی میں من کے معنی دل کے ہیں اور دل کو حبشہ کہتے ہیں اور ہندی میں دل بھی کہتے ہیں۔ اگر کسی کو حبشہ خوب ہوتا ہے تو اس کو

جس وقت کہ صوفی آواز سنتا ہے تو اس کے کان میں پہنچ کر جگر میں سنی جاتی ہے اور وہ صوفی جو کہ ساکن المحبت ہے اس کو جنبش ہو جاتی ہے۔

جب مندل دل میں دھمکے
یہ رنکب رنگ میں جھمکے
یہ صوفی تن پر ٹھمکے

فرمایا کہ جب مجلسِ سماع منعقد ہو اور نے [بانسری] سے سوز اور رباب سے ساز پیدا ہونے لگتا ہے تو صوفی جانباز اسرارِ الٰہی کے معرکے میں ہوتا ہے۔ اس وقت عود جلانا چاہئے کہ عود ان صوفی کا دل اور جان ہوتا ہے۔ اور صوفی کی جان مثل عود کے انگھیٹی میں جلتی ہے۔ بیت:

ایں مجمر دل چوں آتش
می سوزد عود چو جانش
ایں عاشق تن بر یانش
ایں صوفی سرِ الٰہی
ایں مرتبہ دارد شاہی
ایں مظہر عین خدائی

["خزانۂ رحمت" صفحہ نمبر ۳۴۔ ۴۳۳ نسخہ برہان پور]

ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے اس سلسلے میں "خزانۂ رحمت" کی وہ عبارت بھی لکھی ہے جو حضرت شاہ باجن نے تحریر فرمائی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

ہمیشہ کارِ صوفی آنست کہ بر آوازِ نے کہ در سمع او رسد آں را بر حق عقل کند کہ ہر شے مظہر او مست وگرنہ از چوبِ رباب ایں رازے از رودۂ خشک ایں نالش نازہائے موزوں چوں بر آمدے کہ شبہ مرقورہ تجلی منالرب فرد:

اسرارِ عشق تست کہ می خیزد از رباب
ورنہ ز چوبِ خشک مرا ایں گماں بود

مولوی خلیل الرحمان [صاحبِ "تاریخ برہان پور"] حکیم شمس اللہ قادری اور [بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مذکورہ اشعار کو یوں لکھا ہے:

یوں باجن باجے رے اسرار چھاجھے
مندل میں دھمکے رباب رنگ میں جھمکے

یوں باجن باجے رے اسرار چھاجھے

نسخۂ لاہور[اورینٹل کالج لاہور] میں سے پروفیسر حافظ محمود نے یوں نقل کیا ہے:

یوں باجن رے اسرار چھاجھے
جب مندل منہ منہ د جھمکے
یہ رباب رنگ میں کٹھمکے
یہ صوفی ان پر رقصے

[من منہ = من میں[جدید شکل] صفحہ

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی مرحوم نے "خزانۂ رحمت" نسخۂ برہان پور کے پیشِ نظر حضرت موصوف شاہ باجن کی ایک اور نظم اپنی کتاب "سخنورانِ گجرات" لکھی ہے۔ وہ یہ ہے:

تیرے پنتھ کوئی چل نہ سکے
چیری چلے سو چل چل تھکے
پڑھ پنڈت پوتھیاں دھویاں
سب جانا سودھ بدھ کھوئیاں
یہ جوگیوں جوگ بسارے
یہ تپئی تب بکارے
ایک درشنی درشن بھولے
سر ناگے پانو نہ کھولے
ایک سوری ہوئی کر سو کرنا
ہوئی بر تپنی کیا دکھ دھرنا
ایک درویش ہوئی کر آئے
ہوئی قلندر روپ بھر ائے
ایک ابدال ہوئی ابد ہوئے
ایک ہانڈ میں بابا ہوئے
ایک کھلی ہوئی دیوانے
ایک بادل ہندہ رانے

ایک ماتی ہوئی اراویں
یہی بے سدھ ہو ہو جاویں
ایک جنگم جٹا دھاری
ہور ہندہ نس اندھیاری
ایک مند کنکل کی کرنہ
ایک پھونک پھونک باولے بھوتیں دھرنہ
ایک رہیں اپاسی راتنہ جاگنہ
ایک بہکاری باوے بھوتیں دھرنہ
یوں ٹولی ٹولی ہوائی کرے
سبہ رل رل گھل گھجل ہوئی کرے
ولے مکت میں یوں دیکھے
ری باجنؔ توں کس لیکھے

مشکل الفاظ گوجری کے: پنتھہ=راستہ' جیری=جو بھی' سبہ=سب' تپی=تپ کرنے والے= پانوں=پاؤں' کہولے=کھلے' سیوری=جین سادھو' سیو کرنہ=سیو کریں' عبادت کریں' بریتی=بڑے مشکل تپ کرنے والے' ابد=عبادت' ہانڈہ=آوارہ گردی' کھلی=گھلے=کھیلے=دیوانہ بادل=پاگل' بندہ رالے=آوارہ گردی کرلے۔ حضرت شاہ باجنؔ کی اس مذکورہ نظم کو ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے بھی اپنی کتاب میں تھوڑے فرق کے ساتھ درج کیا ہے۔ روپ بھرائے=روپ بھرے' ابد=عبد=غلام' ہانڈ ہیں=باندی میں' ہادی میں' ماتی=مست' اوراویں' گرجس=چلائیں' بے سدھ=بے ہوش' بہوتیں=بہت ہی' راتنہ=راتوں کو' جاگنہ=جاگتے میں۔
یہ نظم "خزانۂ رحمت میں شاہ باجن نے "نسخہ برہانپور" کے صفحہ ۱۹۱ پر لکھی ہے۔ اس نظم سے پہلے "خزانۂ رحمت" میں درج ذیل عبارت لکھی ہے:

"فریضہ گشت نماز پنج گانہ در معراج این فقیر بزابانِ ہندی چیزے گفتہ است۔"

"خزانۂ رحمت" کے نسخہ کراچی میں یہ نظم صفحہ ۳۷ا پر درج ہے اور نسخہ لاہور میں صفحہ ۱۲۶ پر لکھی ہے۔ حضرت شاہ باجن نے ایک نظم پنہاں زاری کے متعلق لکھی ہے اور فرمایا ہے کہ پنہاں زاری کرنا مقام انبیاء علیہ السلام

ہے۔ خَلوت میں رونا یعنی ایسی جگہ جہاں تجھے کوئی دیکھ سکے اور نہ تو کسی کو دیکھ سکے اور جب بھی وقت پڑے ہمیشہ دل ہی میں رولیا کرے۔ کہ درویش کو دل ریش اسی معنی میں فرمایا ہے کہ ہمیشہ درویش کا دل زار زار ہے۔ خواہ وہ خلوت ہو یا جلوت۔ وہ نظم یہ ہے:

خَلوت جلوت باجنا تجھ منجھ ہوئے سو ہوئی
یہی توں نہیں میررا تجھ بن اور نہ کوئی
جیو جیو را تجہ دہرا کہوں اور نہیں میرے کوئی
چوں تو بیا ستم دگرنا باشد تجھ منجھ ہوئی سو ہوئی
روئے روئے معیہ پرکت کیجئے ہنس ہنس سان نہ تج
خنداں گریاں بادل بریاں پر ہنس سان نی لیجئے
باجن باجن سا تمہیں اس بن اور نہ سوجھے
پنہاں تنہا تن تن تنہا دوجا کوری بوجھے

اس مذکورہ نظم کو بشیر محمد ایڈوکیٹ مرحوم نے اپنی کتاب میں "دوہرہ ریختہ" لکھا ہے[۸۷] اور اس مذکورہ نظم کو ڈاکٹر شیخ فرید نے بھی "دوہرہ" کہتے ہوئے درج کیا ہے۔ اس میں فرق یہ ہے:

خَلوت جلوت باجنا تجھ مجھ ہوئے سو ہوئے
نہیں تون تو نہیں میزرا تجھ بن اور نہ کوئی
چو تو بیا شم دگر نباشد تجھ مجھ ہوئے سو ہوئے
روئے روئے عینہ پتکت کیجئے ہنس ہنس ساز نہ دیجئے
خندہ و گریاں بادل گریاں ہر ہنس ساس نا لیجئے
باجن ساجن سرجن ساتھی اس بن اور نہ سوجھے
پیہاں ، تنہا تن تنہا دوجا کو کہ اور نہ سوجھے

اس نظم کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے "خزانہ رحمت" کی وہ عبارت بھی نقل کی ہے جو حضرت باجن نے تحریر فرمائی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

در کلام مجید است تضریحاً و خفیہ یعنی زاری کند پنہاں وگریہ پنہا کردن کار انبیاء علیہ السلام است و گریہ کند کسے ترا و نونہ بنی کسے را اگر دست ندہد دایم بہ دل ندامت نکنند کہ درویش زار زار است۔ چہ در خلوت و چہ جلوت۔

اسی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب موصوف نے شاہ باجن کے ملفوظات سے ایک فرد اور حضرت مسعود بک کے اشعار بھی تحریر فرمائے ہیں جن سے شاہ باجن کی مذکورہ نظم کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ وہ فرد اور اشعار یہ ہیں:

فرد: سالہابعد این تمنا بودہ ام اے دل فریب
تو و من باشد نباشد ثالثے یا مادگر

مشہور روحانی بزرگ حضرت مسعود بک [بیدر] کے اشعار:

ایکہ تا بادہ نبو شیم بیک جا من و تو
سلسۃ در خلوت دل رستہ زغوغا من و تو
بلبل و گل، من و تو، طوطا و شکر من و تو
یوسف دل شدہ دلدار زلیخا من و تو
گر چہ الثالث با لخیر بگوید خلقے
شر محض است کہ باشد دگرے من و تو

شاہ باجن کی یہ مذکورہ نظم "خزانۂ رحمت" کے صفحہ ۲۴۲-۲۴۳ پر درج ہے۔

مشکل الفاظ گوجری کے: میرزا = میرا = میں + را 'جیو = جان 'دھرئی = دھرے 'پرکت = ظاہر 'پرکٹ کیجئے = نہ ظاہر کیجئے۔

نسخہ برہان پور میں ساز کے بجائے ساس لکھا ہے۔ نسخہ برہان پور میں فرد کے بعد لکھا ہے۔ حضرت ملک زادہ مسعود بک فرماید۔ [حضرت ملک زادہ مسعود نے فرماتے ہیں] حضرت موصوف مسعود بک کے مذکورہ اشعار "خزانۂ رحمت" کے نسخہ کراچی میں صفحہ ۹۱-۲۹۰ پر درج ہیں۔ اب آپ حضرات شاہ باجن کے دوہرے اور وہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو ہندی میں ہیں

باجن جب تک ہے یہ دم
تب تک قائم رہے قدم
باجن جی تو سنجا لوری نجی دم کے دام
چیتل جی سوں کو لوک ہیں تو بہلی رلے آویں کام
گور اندھیاری در بدا باجن کھڑا مفلس
پیرا کیسے جیو ڈرئے یہ دوکھ
ساجن ساجن آکھی تیرا

سب کو کہیے میرا میرا
باجن بھکاری کیا بکھان کرے گا
ولے اپنی بھیکہ کارن کچھ کچھ کہے گا
جو کچھ قسمت ہے یہی ملے گا
گدا کوں تبو ہی مانگیا کرے گا
باجن اپنے باپ سب جن رو روو ھوئے
پانی نینوں نہ اھیا ' تب لوہو روئے

واضح رہے کہ باپ کا اشارہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ہے۔

ساجن تجھ بن نہ جگت چنت باری کوئی
سَاجن تیرا کرم مجھ لوری اور کچھ ہوئی نہ ہوئی

اس کا ترجمہ اردو میں ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم نے اپنی کتاب میں اس طرح کیا ہے:

اے ساجن تیرے سوا دونوں دنیا کی کوئی چیز میرے خیال میں نہیں آتی۔ مجھے تیرا کرم چاہیے کچھ ہوئے نہ ہوئے۔[۱۸۸]

روزے دہر دہر نماز گداز دلے دینے فرض مکات
فضل تیرے بن جھونک تا نہیں کہیں نکیں بات

گوجری زبان کے الفاظ: جھونک نان رہیں = جات چھٹکارا نہیں ' آگیں نکھیں بات = آگے کچھ بھی

ان سارے دلائل کی روشنی میں جو میں نے اس مضمون میں تفصیلات و حوالا جات کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ یہ بات بخوبی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ برہان پور کے عظیم المرتبت روحانی بزرگ اور ولیٔ کامل حضرت باجن اردو کی قدیم شاخ گوجری کے عظیم شاعر تھے۔ اور آپ نے اب سے قریب ۶ سو سال پہلے جب کہ اردو زبان کا جنم ہندوستان میں نہیں ہوا تھا۔ مخلوط بولی کو بڑھاوا دینے کے لئے گنگا جمنی شاعری نویں ہجری میں کی ہے وہ تمام ہندی' فارسی اور گوجری زبانوں کے فقروں کا استعمال کیا ہے دہلوی زبان نہیں جیسا کہ ہمارے چند قابلِ احترام بزرگ حضرات نے تحریر فرمائے ہیں۔ اردو کی قدیم شاخ گوجری زبان کے اوّلین شعراء کرام میں باعزت شمار کئے جانے والے حضرت شاہ باجنؒ کا تمام کلام ان کے ۱۵ ویں صدی ہی میں لکھے ہوئے ان قلمی ملفوظات میں موجود ہے جو ہمارے ادب و علم کی زینت بنا ہوا ہے۔ جسے ہم ''خزانہ رحمت'' میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

2461

ہمارے صوبے اور خاص طور سے سر زمینِ برہان پور پر یکے بعد دیگرے جن ناقدین اور محققین نے انتھائی جاں فشانی کے ساتھ برہان پور کی تحقیقی تاریخ مرتب کی ھے ان میں اختر پرویزؔ کا نام بھی احترام سے لیا جاتا ھے. وہ ایک تخلیق کار اور نقّاد کی حیثیت سے اردو کی دنیا میں خود کو متعارف کرا چکے ھیں.

اور اب اپنی زیرِ نظر تصنیف "شاہ باجنؒ ۔ایک مطالعہ" کے ذریعے انھوں نے جن تحقیقی پہلوئوں پر سنجید گی کے ساتھ روشنی ڈالی ھے ،وہ قابلِ ستائش ھیں.خاص طور سے ایسے گوشوں کو جن کا تعلّق اردو کی ابتدائی شاعری سے بھت گھرا رھا ھے ' اپنی اس کتاب میں زیرِ بحث لا کر اھلِ فکر و نظر کو متوجّہ کیا ھے.

یہ کتاب جھاں ایک طرف اردو زبان کی ابتداء کے سلسلے میں "نئی بحث" کا آغاز کرتی ھے ،وھیں برھان پور کی زمین پر دو روحانی بزرگوں کی آمد اور ان کی دینی کارناموں کی دستاویز بھی بن سکتی ھے.

[ڈاکٹر عزیزؔ اندوری] ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۵ء